
تجھے ہم ولی سمجھتے
جو نہ بادہ خوار ہوتا
غالب
مجلس اردو لاہور

یادِ غالب

مرتبین کار:-

خالد بزمی
خالد شفیق
صابر گیلانی

مجلسِ اردو • لاہور

طابع و ناشر:- مجلسِ اُردو، لاہور

کتابت:- مشاہد حسن، ادارہ فروغ کتابت

مطبع:- ثنائی برقی پریس

بار اوّل:- فروری ۱۹۶۹ء

ہدیہ:- [redacted] احترامِ غالب

روحِ غالبؔ

کے

نام

گذارشِ احوال

زیرِ نظر مجموعہ "یادِ غالب" دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی مرحوم کی صد سالہ برسی کے تاریخی موقعے پر اشاعت پذیر ہو کر منظرِ عام پر آ رہا ہے اور یہ افتخار و شرف مجلس اردو لاہور کو حاصل ہے کہ وہ غالب مرحوم کے حضور میں یہ ارمغانِ عقیدت پیش کر رہی ہے۔

اس مجموعے میں کچھ نظمیں شامل ہیں جو غالب کی عظمت کے اعتراف پر شاہد ہیں اور باقی مختلف قدیم و جدید شعرائے اردو کی وہ غزلیات ہیں جو غالب کی مختلف غزلوں کی طرحوں میں کہی گئی ہیں اگرچہ اس مختصر سے مجموعہ منظومات کی ترتیب و اشاعت کے مختلف مراحل ایک حد تک صبر طلب تھے لیکن اپنی ہر ممکن خواہش و کوشش کے باوجود اس کام کی تکمیل کے بعد ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ:-

ع حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کا مقام اس قدر بلند و بالا ہے کہ اس کے حضور میں بڑے سے بڑا نذرانہ بھی حقیر اور معمولی معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال اپنی ہمت و استطاعت کے مطابق یہ کوشش جو کچھ بھی ہے، اس کا محرک مرتبین کے دلوں کا اخلاص اور خود مرزا غالب مرحوم کا احترام اور عقیدت ہے۔

یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ان منظومات پر مشتمل ہے جو غالب کی شخصیت اور اُس کے فن کو خراجِ تحسین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دوسرے حصے میں ان مرحوم شعراء کی غزلیات ہیں، جنہیں ایک حد تک "قدیم شعراء" میں شمار کیا جا سکتا ہے اور تیسرے حصے میں ان شعراء کی غزلیات ہیں جن میں بیشتر آج بھی زندہ ہیں اور جنہیں ہم "جدید شعراء" میں شامل قرار دے سکتے ہیں۔ موخر الذکر دونوں حصوں میں غزلیات کی ترتیب قدرے مختلف ہے۔ "قدیم شعراء" کی غزلیات میں حفظِ مراتب

کا خیال ضروری تھا۔ اس لیے یہاں ترتیب ردیف وار نہیں ہے بلکہ ان کے مقام و مرتبہ اور شاعرانہ عظمت کے مطابق ہے۔ البتہ "جدید شعراء" کی غزلوں میں نہایت غور و فکر کے بعد یہی مناسب سمجھا گیا کہ انہیں "دیوانِ غالب" کی ترتیب کے مطابق درج کیا جائے تاکہ تقدّم و تاخر کا اعتراض نہ رہے کیونکہ شعراء کا طبقہ عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ سریع الاحساس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے کتاب کی اشاعت سے پیشتر کسی شاعر کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ ترتیب کس اعتبار سے ہو گی۔

مجلس اردو لاہور نے یہ کتاب مرتب کر کے کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہو یا نہ دیا ہو لیکن یہ خصوصیت ضرور اس مجلس کا ایک کارنامہ سمجھا جائے گی کہ یہ کتاب "قیمتاً" نہیں بلکہ غالب شناسوں اور غالب کے قدردانوں کو مفت پیش کی جا رہی ہے۔

ہم یہ کتاب اردو کے جن بہی خواہ افراد اور اداروں کی معاونت سے بلاقیمت پیش کرنے کے قابل ہو سکے ہیں ان میں ڈاکٹر سلام الدین نیاز (ٹیکسیشن آفیسر لاہور کارپوریشن و صدر ویسٹ پاکستان میونسپل اینڈ لوکل باڈیز ایمپلائز فیڈریشن لاہور) چودھری محمد امین (کونسلر لاہور کارپوریشن) جناب حکیم جمال سویدا (مالک و مہتمم دواخانہ حکیم محمد اجمل خاں دہلوی مرحوم) جناب خوشنود قریشی (پبلک ریلیشن آفیسر لاہور کارپوریشن) جناب ظہور الٰہی آف گجرات۔ ایم این خان (مارکر الکائیڈ) ایسے علم دوست اور ادب پرور مشاہیر کے علاوہ یونائیٹڈ بینک مارکر الکائیڈ، دول ہاؤس، بینز انڈسٹری بیبے زری فیکٹری ایسے ادارے بھی شامل ہیں جو سب کے سب ہمارے انتہائی شکریے کے حقدار ہیں۔ ان حضرات اور اداروں کی امداد و معاونت کے بغیر شاید مجلسِ اردو غالب کے حضور میں یہ ارمغانِ عقیدت پیش کرنے کے قابل نہ ہو سکتی۔ اس لیے ان سب حضرات اور اداروں کے لیے ؎

ہر مو ہمارے تن میں زبانِ سپاس ہے (غالب بہ ادنیٰ تصرف)

مُرتبین

ڈاکٹر سید عبداللہ

عظمتِ غالبؔ

غالب بالاتفاق (شاید اقبالؔ کے بعد) اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور غزل کے فن میں شاید اقبال سے بھی بڑے ہیں۔ کسی شاعر کی عظمت کا ایک ثبوت تو خود اُس کا قبولِ عام ہے لیکن محض قبولِ عام کو عظمت کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ قبولِ عام بہر حال ایک اضافی، اعتباری اور وقتی شے ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شاعر اپنے زمانے میں مقبول ہو مگر بعد کے زمانے میں لوگوں کی نظر میں نہ جچا ہو۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے زمانے میں مقبول نہ ہوا ہو مگر بعد کے کسی دَور میں خلقت کے جذبوں کا ترجمان بن گیا ہو۔ غرض یہ ہے کہ قبولِ عام عظمت کی کوئی مستقل دلیل نہیں۔ اگرچہ یہ بھی ایک دلیل ہے ضرور — زبانِ خلق نقارۂ خدا بھی ہے اور نقارۂ مخلوق بھی۔

سو غالب کی بڑائی کی ایک دلیل یہی اُن کا قبولِ عام ہے — لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا غالب کی بڑائی کی کچھ اور دلیلیں بھی ہیں جو خود قبولِ عام کا باعث بھی ہیں۔

غالب کے قبولِ عام کا ایک باعث یہ ہے کہ وہ سب انسانوں کے بنیادی اور مشترک جذبوں کی ترجمانی کرتے ہیں — یوں تو سبھی شاعر جذبوں کے ترجمان ہوتے ہیں مگر بعض شاعر ہمہ نسان اور ہمہ روگ جذبوں کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ مثلاً یہی دیکھیے ولیؔ زندگی کی لطیف نشاطیہ میلان کے نمائندہ ہیں، مگر اُن کی شاعری زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت کو بالکل نظر انداز کر گئی ہے — یعنی ان کے کلام میں انسان کا بنیادی مسئلہ غم موجود ہی نہیں۔ ولیؔ اس لیے صرف اُن لوگوں کے شاعر ہیں اور اُس دَورِ زندگی کے شاعر جب جوانی زندگی کو

ایک مفہوم بخش رہی ہوتی ہے۔ اس دور سے باہر دلی کی شاعری کھوکھلی اور قصہ پارینہ معلوم ہوتی ہے

اسی طرح میر تقی میر زندگی کی بنیادی حقیقت غم کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ صرف اسی حقیقت کو مانتے ہیں باقی جو کچھ ہے اسی کے تابع ہے۔ ان کی شاعری میں بہار بھی خزاں کا ایک روپ ہے۔ ان کے چمن میں پھول اُمید اور حسن کے نمائندہ نہیں بلکہ غم و اندوہ کے نمائندہ ہیں۔ ع

دل پر داغ ہی اپنا چمن ہے　　　　کہ ہر غنچہ دل پر آرزو تھا

وغیرہ وغیرہ۔ غور کیا جائے تو یہ زندگی کا آدھا تصور ہے۔ زندگی عبارت ہی رنج و راحت دونوں سے۔ یعنی باری باری اور نوبت بہ نوبت۔ یہ صرف رنج نہیں، یہ صرف راحت بھی نہیں البتہ عقلی تجزیے سے اس کے رنج کو بھی گوارا بنایا جا سکتا ہے۔ غرض زندگی کے یہ دونوں عناصر حقیقی ہیں۔ مگر میر کے یہاں صرف ایک ہی روپ، فقط — یعنی غم کا۔ اس کے برعکس غالب کی شاعری، مذکورہ شاعروں کی شاعری کی طرح ادھوری نہیں بلکہ زندگی کی کل حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں غم کی حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے مگر یہ بھی باور کرایا گیا ہے کہ غم کے باوجود زندگی کو گوارا بنایا جا سکتا ہے۔ جینے کی آرزو اور غم کو راحت میں بدلنے کا سلیقہ اگر ہو تو غم نہیں رہتا غالب کی شاعری کی یہ کلیت قبولِ عام کے لیے ہر ذہن کو تیار کر دیتی ہے۔ وہ ناگوار اور نامطبوع صورتِ حال کی شکل بدل دیتے ہیں اور ناگواری کا نئے انداز سے تجزیہ کر کے، اس میں خوشگواری کا رنگ پیدا کر دیتے ہیں۔

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیٔ روشِ دستیٔ ادا کہیے!
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

غالب کا یہ اندازِ فکر کہ "بہار تو ہے" بڑی خوبی سے ذہن کو ایک ناگوار اور ناموافق صورتِ حال کے بارے میں مطمئن کر دیتا ہے، "نہیں نگار کو الفت ... نہ ہو" مگر یہ کیا کم

ہے کہ نگار کا حسن خرام اور اس کی مستی ادا دل کو مسحور کیے دیتی ہے۔ غالب راحت کی ہر صورت سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں اور مثالی کی جستجو میں وقت کو تلخ نہیں کرتے۔ جو ہے وہی اور وہ بھی ٹھیک ہے۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اِک بوند لہو کی!

ان اشعار میں راحت اور خوش گواری کی ایک صورت ناخوش گواری ناتمامیت اور ناقابلِ اطمینان صورت حال سے نکالی گئی ہے۔ زندگی سے نباہ کی یہ صورت طبع انسانی کے لیے ناقابلِ قبول اور آرزوئے حیات کے لیے معاون ثابت ہو رہی ہے۔ انسان ہر حال میں جینا چاہتا ہے جو چیز جینے کی آرزو اور جینے کے سلیقے میں اضافہ کرے انسان اُسے پسند کرتا ہے۔ غم کے اثبات کے ساتھ زندگی کی یہ سلیقہ شناسی یا سلیقہ آموزی غالب کو ہر دل کے قریب کر دیتی ہے۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ غالب زندگی کے ہر دور میں موافق طبع اور دل پسند ہیں۔ بخلاف دوسرے درجے کے شعراء کے جو عمر کے ایک خاص دور کے باہر بے مزہ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً حسرت موہانی کہ ان کا کلام صرف چڑھتی جوانی میں اچھا لگتا ہے یا جگر مراد آبادی کہ ان کا کلام سنجیدہ طبع لوگوں کو بہت کم

متاثر کرتا ہے۔ غالب کا کلام عمر کے ہر دور میں خوش آہنگ معلوم ہوتا ہے اور یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ غالب پورے انسان کے شاعر ہیں یعنی اس کے ہر دور کے جذبوں کے شاعر ہیں۔

جب کسی شاعر کا کلام ایسا ہو جاتا ہے تو یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ اپنے زمانے سے آگے بھی قبول پائے گا۔ مستقبل میں بھی لوگ اسے اپنا ہی شاعر خیال کریں گے اور اس کے کلام کو اپنے جذبوں کا ترجمان بنائیں گے۔ پھر یہ شاعر اپنے ہی ملک کے لوگوں کو متاثر نہیں کرے گا بلکہ اپنی لسانی مملکت سے باہر کی دُنیا کو بھی محظوظ کر سکے گا۔ اس کے اشعار کے ترجموں میں وہی حظ ہو گا جو اس کے اوریجنل میں ہے۔۔ ایسے ہی شعراء آفاقی اور عالم گیر ہوتے ہیں اور غالب کو ایسا ہی ایک شاعر سمجھا جا سکتا ہے۔

عام جذبوں کی بات سے قطع نظر ـــــ غالب زندگی کی تازگی کا مدعی و آرزومند شاعر ہیں یہ قاعدہ ہے کہ فرد کا معاشرہ جب اپنے اردگرد کے حالات کی یکسانی و بے رنگی سے اکتا جاتا ہے تو وہ زندگی کو بدلنے کا آرزومند ہو جاتا ہے اور اسی پے بہ پے تبدیلی سے زندگی کے چمن میں نئی رونق، نئی بہار نمودار ہوتی ہے۔۔۔۔ جو شاعر اس تازگی کا آرزومند ہوتا ہے وہ اپنے اردگرد کے حالات کی بے رنگی کے خلاف احتجاج کرتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ احتجاج کی طاقت کسی معمولی دل و دماغ کو میسّر نہیں ہوتی۔ یہ صرف بڑے اور غیر معمولی رجال و ابطال کے حصّے میں آتی ہے۔

غالب بھی ان "بڑے رجال" میں سے تھے جن کے حصے میں احتجاج کی طاقت تھی۔ چنانچہ غالب کے کلام میں تازگیٔ حیات کی خاطر احتجاج کا بھرپور نعرہ موجود ہے ؏

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم

اسی طرح ؏ رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم اور بلاشبہ یہ آواز کسی فکری یا ادبی مجاہد ہی کی ہو سکتی ہے جو کاروبارِ عالمِ کہنگی سے اُکتا چکا ہو اور جس کے قلب و جگر میں یہ طاقت بھی ہو کہ وہ

نعرۂ انا اسد اللہ لگا سکے۔ اقبال کے سوا یہ نعرہ کہیں اور سنائی نہیں دیتا۔

بعض اہلِ قلم نے غالب کی دلکش شخصیت کو بھی ان کے اسبابِ عظمت میں شمار کیا ہے مگر میں اس ادبی محاکمے میں ان کی شخصیت کو ان کے ادبی کارنامے پر زبردستی ٹھونسنا نہیں چاہتا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ کسی ادیب کی شخصیت اس کارنامے سے الگ نہیں ہو سکتی مگر شخصیت کسے یہ دپ خود کارنامۂ ادب نہیں۔ ادبی کارنامہ الگ شے ہے اور غالب کی عظمت کارنامۂ ادبی کی وجہ سے ہے نہ کہ شخصیت کی دلکشی کی وجہ سے۔ ہزاروں افراد غالب کی طرح کثیر الاحباب ہوئے ہیں مگر وہ غالب نہیں بن سکے۔ لاکھوں افراد غالب سے بھی زیادہ آم کے شائق ہیں مگر وہ غالب نہیں ہو سکے۔ ہزاروں افراد غالب ہی کی طرح بذلہ سنج و ظریف ہوں گے مگر غالب بننا صرف غالب کے حصے میں آیا۔

مقصد یہ کہ ادبی عظمت کے ذکر میں شخصیت کی دلکشی کا غیر معتدل پیوند، تنقیدی بے ادبی اور ایک طرح کی زبردستی ہے۔

غالب نے اپنی شاعری میں کل انسان کے جو جذبے بیان کیے ہیں ان کی تاثیر یا ترجمانیت میں غالب کے نادر اسلوب کا پورا حصہ ہے۔ خصوصاً اردو کلام میں، غالب نے اپنی شاعری کو وہ بدیع اسلوب عطا کیا ہے جو اس خاص تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے جس کا ایک خاص اسلوبِ حیات تھا۔ اس اسلوبِ حیات میں فارسی ترکیب اور لفظوں کی مغلئی شان و شوکت بنیادی عناصر ہیں۔ غالب کے کلام میں مغلوں کے دورِ اقتدار کا ایک غیور شخص بول رہا ہے۔

غالب نے اپنے اسلوب بیان کے ذریعے اس مضمحل اور ناتواں اور نسوانی آواز کی مخالفت کی ہے جو دلی کی آخری شاعری اور لکھنؤ کے دورِ عروج میں نمایاں ہو کر ضعف و اضمحلال کا پتہ دیتی ہے۔

اردو جس قوم کی زبان ہے اس کے لہجے میں کڑک اور قوت ہونی چاہیے۔ وہ روزمرہ جو ہندی روزمرے سے جا ملتا ہے اور فارسی ترکیب اور پُر شوکت الفاظ سے دور لے جاتا ہے

اس میں وہ کڑک اور قوت نہیں۔ وہ دورِ انحطاط کی نمائندگی کرتا ہے، واضح ہو کہ میر و سودا اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس لیے کہ ان کا کلام سہل اردو ہونے کے باوصف جذبوں کی شدت اور گہرائی کا حامل ہے اور گہرائی بھی بہرحال ایک غیر معمولی امر ہے۔

فارسی ترکیب، اور پُر شوکت الفاظ کا یہ ورثہ غالب سے اقبال نے بھی پایا۔ اور یہ امر اقبال کے لیے بھی ایک وجۂ امتیاز ہے اور غالب کے لیے تو یہ ہے ہی کیونکہ غالب کا اسلوب بیان تہذیب کے دورِ اقتدار سے، اقبال کے مقابلے میں زیادہ قرب زمانی اور قربت مکانی رکھتا ہے اور ان جذبات و احساسات اجتماعی سے ہم آہنگ ہے جن کی ترجمانی غالب کے حصے میں آئی ہے۔

غالب کی ناموری کے اور اسباب بھی ہوں گے لیکن میں نے اپنی دانست میں مرکزی اسباب کی نشاندہی کی ہے جن کا خلاصہ یہ ہے: اوّل:۔ غالب فطرت انسانی کی پوری نمائندگی کرتے ہیں۔ دوم:۔ غالب صرف اپنے دور سے مخصوص نہیں بلکہ اپنے دور سے آگے بھی قابلِ قبول ہیں۔ سوم:۔ صرف اپنے ملک کے لیے نہیں بلکہ ملک سے باہر بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ چہارم:۔ غالب زندگی کی تازگی کے مدعی ہیں اور اور اس کے لیے احتجاج کو ضروری سمجھتے ہیں۔ غالب موت کو مانتے ہیں لیکن ہر صورت وہ زندگی کے شاعر ہیں۔ جینے کی آرزو رکھتے ہیں اور جینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں اور آخر میں یہ کہ غالب اپنی تہذیب اور اس کی شوکت کے مداح اور مصوّر ہیں اور ان کا اسلوب ضعیف روزمرہ نویسی اور عوامیت کے خلاف بھرپور احتجاج ہے اور یقیناً ان کے کلام کے قبولِ عام میں اس خصوصیت کا بھی حصہ ہے۔



جگرِ لخت لخت

دل میں ذوقِ وصل ویادِ یار تک باقی نہیں
آگ اِس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

بوئے گل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا!

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

ذکر اس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

یارب نہ وہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

دونوں جہان دے کہ وہ سمجھے، یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

ملنا ترا، اگر نہیں آساں، تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز غیر سے چاہئے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

نکلنا خُلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نغمہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

آئینہ خانہ

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا
(غالب)

جہانِ غالبؔ

یہ تری زبانِ غالبؔ، یہ ترا بیانِ غالبؔ
یُونہی معترف نہیں ہے، ترا اک جہانِ غالبؔ

ترا فکر اُڑ کے پہنچا، حدِ آسماں سے آگے
کبھی عرش تھا بغل میں، کبھی لامکانِ غالبؔ

جو ترے قلم سے نکلے، وہ حروف تھے کہ موتی
تری آستیں میں پنہاں، تھی گہر کی کانِ غالبؔ

تری نثر دل رُبا ہے، تری نظم جاں فزا ہے
تری بذلہ سنجیوں سے، ہے ادب میں جانِ غالبؔ

غمِ حُسن و عاشقی کا، کبھی ترجمان تو ہے
کبھی حسن و عشق خود ہیں، ترے ترجمانِ غالبؔ

ہے قلمروِ سخن کا شہِ دلربا رقم تو
یہ فصاحت و بلاغت ہے ترا نشانِ غالبؔ

یہ بلندیِ تخیّل کی فلک نمائیاں ہیں
سرِ کاخِ آسماں ہے، ترا آستانِ غالبؔ

یہ حقائق و معارف، یہ مطالب و معانی
یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیانِ غالبؔ

"تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا"

نظیرؔ لدھیانوی

غالبؔ

اُجلا سا ذہن، درد کی تصویرِ دلِ غنی
فن کا مزاج، فن کی عقیدت کی روشنی

محبوس سے الاؤ کے شعلے جگا دئے
وابستگانِ درد کے چہرے سجا دئے

اپنی نہج پہ ذہن کو خود تولتا رہا
منطق کی فلسفہ کی گرہ کھولتا رہا

تنظیمِ فن میں جذبۂ فن کا اسیر تھا
بکھرے ہوئے سے شہر میں روشن ضمیر تھا

جولانگہِ خیال میں یکتا خیال امام
جس کے حضور پیکرِ ادراک کا قیام

تابندگیٔ لفظ و معانی کا تاجدار
آئینِ استعارہ و تشبیہہ کا وقار

جس کا قلم تھا ذوقِ محاکات کا امیں
جس کے سخن میں تربیتِ عشق بھی حسیں

تمکینِ ماورائے غم و کیف و کم بھی تھا
تسکینِ آرزوئے دلِ مغتنم بھی تھا

تکیہ نہ تھا نگہہ کی رسوم و قیود پر
تنہا کھڑا تھا جوشِ جنوں کی حدود پر

عاطرؔ ہاشمی

غالب امامِ غزل

غالب کہ فنِ شعر کو دیں جس نے وُسعتیں
غالب کہ جس نے اہلِ سخن کو دیا شعور

اُردو زباں کو جس نے پلایا ہے خونِ دِل
جس نے سُخنوروں کو دِیا اِذنِ گفتگو

وہ جس نے شاعری کے چمن کو بہار دی،
وہ جس نے علم و فن کی جلائی ہیں مشعلیں

اہلِ نظر نے جس کو "امامِ غزل" کہا
ہر اہلِ فن نے جس کو دیا مرتبہ بلند

جس کو سُخنوروں نے کہا وہ عظیم تھا
جس کو عظیم لوگوں نے جانا عظیم تر

میں اُس کی عظمتوں کو بیاں کس طرح کروں
میں ذرّہ حقیر ہوں میری بساط کیا

ھے جن کے دِل میں نادرہؔ غالبؔ کا احترام
غالبؔ کو شاعری کا سمجھتے ہیں وہ امام

سیّدہ نادِرہ زیدی

تُو صاحبِ تحریر ہے

اے غالبِ شعلہ سخن — تو ہے ضیائے شمع فن
تیرے قلم کا بانکپن — ہر دَور کی تصویر ہے

تو صاحبِ تحریر ہے

تیری نگاہیں دُور رس — تجھ کو بیاں پہ دسترس
اشعار میں تیرے بسی — خوشبوئے عالمگیر ہے

تو صاحبِ تحریر ہے

فکر و نظر کی روشنی — حرف و ہنر کی چاشنی
کل بھی تِری جاگیر تھی — اب بھی تمری جاگیر ہے

تو صاحبِ تحریر ہے

الفاظ کا معمار تو ہر رنگ سے فن کار تو
گویا ترا شہرِ ادب اک نقش پُر تاثیر ہے
تو صاحبِ تحریر ہے

تیرے تخیل کا شجر، ہر رُخ سے پایا پُر ثمر
تیری تگ و دو کا ہنر شرمندۂ تعبیر ہے
تو صاحبِ تحریر ہے

ملکِ ادب کا صدر تو گویا مثالِ بدر تو
تیری ضیا کی ہر طرف جاگی ہوئی تقدیر ہے
تو صاحبِ تحریر ہے

غالب کہ جب غالب رہا رضوانی ہم نے کہہ دیا
تھا میر، میرِ اک دور کا اک دور کا تو میر ہے
تو صاحبِ تحریر ہے

تبسم رضوانی

غالبؔ

مر کے وی پیا جیوے جا گے وڈ تیاں نوں ایہ گچ
آپے سڑیا آپے بلیا آپے لایا مچ

جیون جیون ویلا نگھدا جائے رہیا ودھیرا بچ
ہیرا مٹی دے وچ رہ کے بن نئیں سکدا کچ!

جد ویکھو پیا ڈھلکاں مارے جس دے پلے سچ
اکھیاں نوں چڑھدا سورج وی کدے نہ سکیا پچ

سونہ سالاں توں اوہدیاں کرناں سوچیں رہیاں نیں رچ
اوہنوں کدے گرہن نئیں لگناں نچ اوئے کاشر نچ

سلیم کاشرؔ

مرزا غالبؔ

نِرمل سوچ دا ڈُھگواں اُکھڑ سُرت دا سنگھناں بول
مَلّ کے فن دی اُتلی پِیشی وَتّے دل دے کول
عِشق دی وَکھری راہ دا پاندھی پُٹھّدا پیراں ڈول
حشراں تِیک نِروِیار رہنائیں اوہدا فکر نِدول

شعر دی اَتھری نیں دا تارُو ڈُونگھاں دا وِسنیک
بُلھّاں تے دُکھّاں دی تسبیح اکھیں آس اُڈیک
اُردو دے متھے دا جُھومر فہم دی تِکھّی لیک
سو سالاں دے ساہ دی نگھ وِچ اوہدا ذہن شریک

پنڈی صدی دے ادب دی وٹ تے ٹھکن اوہدے رنگ
وکھری اکھراں دی خشبوئی وکھ لہجے دا انگ
کدھرے سچے خیال دا چانن کدھرے سوچ دا ڈھنگ
کدھرے سجری سجدی مہندی کدھرے روپ دی ونگ

فکراں دی پپی دا موتی ڈھلکے ورگ سنگار!
پھلاں دے لیکھاں نوں پڑھ لے سولاں دے وچکار
فلسفیاں دے بت نوں اکڑے اوہدا ڈونگھا وچار
صوفی دے پلنڈے دا بھیتی سوچاں دا اوتار

ہستی دے بھیتاں دا جانوں رکھے جیبھ نوں روک
سوجھ دا تیر انبر چیرے کھا کے کنہ دی جھوک
ویلے نوں گھیرے طرح رکھدی اوہدے قلم دی نوک
نوشہ، مرزا، اسد اللہ خاں، غالب آکھن لوک

رؤف شیخ

غالبؔ دے حضورؒ

غزل تے غالبؔ رہیوں رہویں گا سچا سئیں فنکار
مشکل قافیے کٹھن ردیفاں حدوں ودھ تکرار!
تیری کھوج نوں کھوجی بھدے اپنے رستیوں کھنجے
فلسفی پڑھ پڑھ دنگ نے ہندے تیری سوچ وچار

دیانتداراں پالیا سب کجھ تک تک تیریاں غزلاں
اُڈ اُڈ دھوڑ دے وانگوں بہہ گئے نقطہ چین ہزار
تیری غزل دا ڈھنگ انوکھا دونویں پہلو پرکھے
حُسن دے لئی نزاکت بندی عشق دے لئی تلوار

اردو نوں ہی تیریاں شعراں بخشیا آبِ حیات
اج دنیا وچ اُچا ہویا اے تیرا شان وقار
اج شہنشاہ کہن غزل دا لئے کے تیرا ناں
جیوندی جانیں قدر نہ پایا اِس بُغضی سنسار
نفرتاں پٹیا جگ اے سارا مطلبی وسّن لوک
حسد تے نفرت تھاں تھاں وکدی مول نہ لبھے پیار
جیوندی جانیں ہڈیاں جالن ٹھوکراں مارن رولن
قبر تے صابرؔ دیوا بالن پاؤن پھلاں دے ہار

اللہ دتہ صابرؔ

"غالب جی اغزل عرض اے"

شُوورھیاں وِچ بھانویں ہو گئی کِنکر توں یاقوت
اِس دُنیا تے پر نہیں جمیا، غالب جیہا سپوت
اوہ اُردو شہزادی جنہوں شاہواں کول بٹھایا
ہیں سمیاں دے بُوہے ویکھی بیٹھی وانگ اچھوت
ادب، ثقافت، غزلاں، گیتاں لکھاں رنگ وٹائے
نئیں بدلی تے اِس دُنیا دی بدلی نئیں کرتوت
جیوندی جانے فنکاراں دی وات نہ پُچھن والے
مویاں پُھلاں نال سجا کے لئی پھردے تابُوت
میں وی ڈِٹھا اے یار تماشہ بدل کے بھیس فقیری
لیراں وی کھوہ لئیاں لوکاں رہ گئی انگ بھبھوت
روشنیاں دے دَور دے بندے معجزیاں تے قادر
باہروں لِشکاں مارن چہرے اندروں کالے دُھوت

قرض ملے نہ ساقی ونڈے، خاک شرابی ہونا ایں
میخواراں وِچ ویکھ رہیا واں ہندی جو تم جوت،

ہُن وی اُنج تے یُوسف وِکدے پر سونے دے بدلے
ہُن اخلاص دے چرخے اُتّے کوئی نہیں کت دا سُوت

عشق جھناں دا اِک کچّے دے ہتّھوں بھبدرم گو اچا
ہُن خبرے کیہ ہووے ہُن تے آوا ای گیا اے اُوت

دل ٹٹن تے ہور نواں دِل ہُن بَل سکدا اے بھجناں
عِشق وِگادے بندے نال مشیناں دین ثبُوت

ہن سُنیا ایں اِنساناں نے اسمانی جا وسناں ایں
رہ جاون گے دھرتی اُتّے جِن، بَلا واں، بھُوت

ہُن وی لوکی بیڑی دے وِچ رولا پاوندے ڈُبدے
ڈُب جاندے نیں پر نہیں من دے اوہ اپنی کرتُوت

غالب جی ایہہ انور ہے نا! جھلّ تپنے دا گہنا
چنگاں وچ ٹہنے بھالے، تمّاں نال شہتُوت

رشید انور

وادیٔ خیال

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدّعا مجھے
(غالب)

ع ۱۔ بے نیازی تری عادت ہی سہی (غالب)

⭕

عشق ذلت ہے تو ذلت ہی سہی
میری ذلت تیری عزت ہی سہی

نہ لکھو نامہ نہ بھیجو پیغام
عشق کی آپ سے نسبت ہی سہی

اژدہامِ غم و اشک و حرماں
پھر بھی فرصت ہے تو فرصت ہی سہی

بختِ ناساز کا ہوں شکوہ سرا
ان کے پردے میں شکایت ہی سہی

کیجئے اغیار سے ملنا موقوف
مجھ کو اُلفت نہیں، غیرت ہی سہی

دعوئے الفت و بے تابی حیف
گر اذیت ہے، اذیت ہی سہی

میری خاطر سے چلو شیفتہ واں
خیر ان سے تمہیں نفرت ہی سہی

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ دہلوی (۲۰)

ع :- مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں (غالب)

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں
گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں
جلوے نے تیرے آگ لگائی نقاب میں

آ نغمہ گر ہو، چرخ میں لا آسمان کو
آ رقص کر، زمین کو ڈال اضطراب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

سالک کی یہ مراد کہ مجھ سا ہو نقش بھی
رہزن کو یہ خیال کہ رہرو ہو خواب میں

اے آفتِ زمانہ! تیرے دور میں شکیب
بلبل کو باغ میں ہے نہ ماہی کو آب میں

بے باک شیوہ، شوخ طبیعت، زباں دراز
ملزم ہوا ہے، پر نہیں عاجز جواب میں

لڑتی نہ جائے آنکھ جو ساقی سے شیفتہ
ہم کو تو خاک لطف نہ آئے شراب میں

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ دہلوی (مرحوم)

ع ۹۔ کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے (غالب)

(۱)

لطف ہے حشر میں کچھ بات بنائے نہ بنے
آنکھ بھی شوخ ستمگر سے چرائے نہ بنے

مجھ کو اٹھوا تو دیا اس نے بھری محفل سے
کون تھا یہ، کوئی پوچھے تو بتائے نہ بنے

تم سے اب کیا کہیں، وہ چیز ہے داغِ غمِ عشق
کہ چھپائے نہ چھپے اور دکھائے نہ بنے

بے کسی کی ہے مصیبت میں شکایت بے سود
کب پڑا وقت کہ اپنے بھی پرائے نہ بنے

غم جو پیارے سے ملے کیوں نہ ہو وہ بھی پیارا
بھولنا بھی اسے چاہیں تو بھلائے نہ بنے

ہے نظر میں وہ سماں، نقش ہے جس کا دل پر
وِرد وہ نام ہے، لب تک جسے لائے نہ بنے

بے خودی میں بھی تو کیفی کی یہ خودداری ہے
حالِ دل پوچھ بھی لے وہ تو سنائے نہ بنے

علامہ کیفی دہلوی

ع:- بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی (غالب)

اور ہی رنگ فصلِ گل لائی
شیخ کی اب کے سال بن آئی

نہ رہی سر پہ منتِ مطرب
طائروں کی ہے نغمہ آرائی

دل پژ مُردہ زندہ ہوتے ہیں
ہے دمِ باد میں مسیحائی

ساغرِ گل سے شیخ و رِند ہیں مست
یاد کرتی ہے بادہ پیمائی

شعرِ غالب سنا کے شیخ نے آج
بادہ نوشوں سے توبہ کروائی

"ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی"

میں نے صوفی اِنداق سے اپنے
داد اپنے کلام کی پائی

صوفی منیری (مرحوم)

ع :- اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا (غالب)

جو بُرے بھلے کی اٹکل نہ مرا شعار ہوتا
نہ جزائے خیر پاتا نہ گناہگار ہوتا

مئے بے خودی کا ساقی، مجھے ایک جرعہ بس تھا
نہ کبھی نشہ اُترتا، نہ کبھی خمار ہوتا

میں کبھی کا مر بھی رہتا، نہ غمِ فراق سہتا
اگر اپنی زندگی پر مجھے اختیار ہوتا

یہ جو عشق جانستاں ہے، یہ وہ بحرِ بیکراں ہے
نہ سُنا کوئی سفینہ کبھی اِس کے پار ہوتا

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو کوئی تم سے کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

ق

ہے اِس انجمن میں یکساں عدم و وجود میرا
کہ جو میں یہاں نہ ہوتا، یہی کاروبار ہوتا

مولانا اسمٰعیل میرٹھی
(مرحوم)

ع: نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے نقاب میں (غالب)

آخر یہ حسن چھپ نہ سکے گا نقاب میں
شرماؤ گے تمہیں نہ کرو ضد حجاب میں

پامال شوخیوں میں کرو تم زمین کو
ڈالوں فلک پہ زلزلے میں اضطراب میں

جاں میں نے نامہ بر کے قدم پر نثار کی
تھا پیشِ پا فتادہ یہ مضموں جواب میں

ہنس ہنس کے برق کو تو ذرا کیجیے بیقرار
رو رو کے ابر کو میں ڈبوتا ہوں آب میں

ساقی اِدھر تو دیکھ کہ ہم دیر مست ہیں
کچھ مستیٔ نگہ بھی ملا دے شراب میں

داخل نہ دشمنوں میں نہ احباب میں شمار
مدِ فضول ہوں میں تمہارے حساب میں

کس کس کے جور اُٹھائیں گے آگے کو دیکھئے
دشمن ہے چرخِ پیر زمانِ شباب میں

پیغامبر اشارۂ ابرو سے مر گیا
پھر جی اُٹھے گا لب بھی ہلا دو جواب میں

مولانا اسمٰعیل میرٹھی
(مرحوم)

ع۔ حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے (غالب)

عبرت انجام ہو جس کا وہ زوال اچھا ہے
عیش ہو جس کا نتیجہ وہ ملال اچھا ہے

گو گنہگار ہوں، لیکن ہوں فدائے اُلفت
گو بُرا ہوں میں مگر میرا خیال اچھا ہے

کیوں نہ ہو دستِ کرم حسنِ طلب کے صدقے
جس سے محبوب ہو سائل وہ سوال اچھا ہے

دل جفا کیش اگر ہے تو کدورت سے بچا
کون کہتا ہے کہ آئینے میں بال اچھا ہے

دل ہے پہلو میں تو وہ درد سے خالی نہ رہے
پھولتا پھلتا جو رہتا ہے نہال اچھا ہے

جس سے کچھ قوم کی بہبود نہ ہو مدِ نظر
ایسی دولت ہو اگر وقفِ زوال اچھا ہے

تم بھی اِس سال غمِ دِل کا مداوا کر لو
"اک نجومی نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے"

محمد الدین فوق (مرحوم)

ع : پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں (غالب)

یہ شرمگیں نگہ، یہ تبسّم نقاب میں
کیا بے حجابیاں ہیں تمہارے حجاب میں

وہ نالہائے درد سے چونک اُٹھے ہیں خواب میں
یہ اور اضطراب ہوا اضطراب میں

اس کی طلب میں ہر نفس آغازِ شوق ہے
رکھتا ہے کون عمرِ گزشتہ حساب میں

جورِ فلک ستم زدہ ناؤ پر کہاں
شانِ ادائے دوست ہے ہر انقلاب میں

ہر سو ہے میرے آتشِ داغِ جگر محیط
گویا سکون ہے کرۂ آفتاب میں

اقرارِ بندگی سے نہیں بندہ پروری
مدِ نظر یہ تھا کہ سنیں "ہاں" جواب میں

لکھتے ہو اس قدر غزلِ مختصر زکی
آزردہ ہوں گے اہلِ مذاقِ انتخاب میں

محمد زکریا زکی

ع :- ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں (غالب)

ے خانۂ ازل میں، جہانِ خراب میں
ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

اقلیمِ جاں میں ایک تلاطم مچا دیا
یوں دیکھئے تو کچھ نہیں تار و رباب میں

اے کاش! میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا
اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں

وہ برقِ رنگ خرمنِ جاں کے لئے کہاں
مانا کہ بوئے گل تو ملے گی گلاب میں

اب کون تشنگانِ حقیقت سے یہ کہے
ہے زندگی کا راز تلاشِ سراب میں

کیوں شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار ہوں
اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

میں اضطرابِ شوق کہوں یا جمالِ دوست
اک برق ہے جو کوند رہی ہے نقاب میں

اصغر گونڈوی (مرحوم)

ع ۱۔ ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر (غالب)

ہمیں اتنی تو ہے اُمید اپنی چشمِ گریاں پر
کہ سیلِ اشک پانی پھیر دے گا فردِ عصیاں پر

تجمل اس چمن میں سر بسر وجہ کدورت ہے
یہاں رنگت بھی گویا گرد ہے پھولوں کے داماں پر

رفوگر تارِ رشتہ آنسوؤں کے تار کو سمجھا
یہ وہی چشمِ سوزن بھی مرے چاکِ گریباں پر

جنوں کا دورِ فصلِ پختگی ہے کشتِ الفت کو
گماں ہے برقِ خرمن کا شرارِ سنگ طفلاں پر

یہاں سامانِ ہستی بھی ہے وجہ نیستی ہمدم
نفس ہے تازیانہ توسنِ عمرِ گریزاں پر

نہاں اخگر صفت تھے جامۂ خاکستری میں ہم
اُسے بھی خود نمائی نے نہ چھوڑا جسمِ عریاں پر

خدنگِ آہِ رسا کا دیکھئے جا کر کہاں ٹھہرا
کلس ہم نے چڑھایا گنبدِ گردونِ گرداں پر

زہے غفلت کہ ناکامی میں ہونٹوں کو چباتا ہوں
مگر عقدہ کشائی منحصر ہے سعیِ دنداں پر

پلائے گر نہ اے فیروزؔ آنسو ضبطِ غم مجھ کو
تلاطم ہو تلاطم پر، ابھی طوفاں ہو طوفاں پر

فیروز طغرائی (مرحوم)

ع:۔ اُس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا (غالب)

اغماض چلتے وقت مروّت سے دُور تھا
رو رو کے ہم کو اور رُلانا ضرور تھا

تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں
ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طُور تھا

دردا کہ لب پہ رازِ دل آیا نہ تھا ہنوز
چرچا ہمارے عشق کا نزدیک و دُور تھا

جانی نہ قدرِ رحمتِ حق پارسا نے کچھ
ٹھہرا قصور وار اگر بے قصور تھا

دُردی کشانِ بزمِ مغاں کا نہ پُوچھ حال
ایک ایک رند نشۂ وحدت سے چُور تھا

اب باریابِ انجمنِ عام بھی نہیں
وہ دل کہ خاص محرمِ بزمِ حضور تھا

روزِ وداع بھی شبِ ہجراں سے کم نہ تھا
کچھ صبح ہی سے شامِ بلا کا ظہور تھا

بیمار کی تو اپنے نہ لی تم نے کچھ خبر
پھر ناز نعش پہ آنا غرور تھا

حالیؔ کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں
تھا حوصلہ اسی کا جو اتنا صبور تھا

مولانا حالیؔ (مرحوم)

دیکھ کے میری بے خودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

پاسِ نزاکت اب نہ کر، چل کے مجھے بتا کہ یوں
حشر سے ہے مرا سوال، اپنا قدم اٹھا کہ یوں

فکر یہ تھا کہ دردِ دل، عشوہ سے کیوں ہے ہمکنار
غمزۂ چشمِ یار نے مجھ کو بتا دیا کہ یوں

عشق سے پوچھتا تھا میں، سوزِ نہاں کی داستاں
نالۂ جاں گداز نے اٹھ کے بتا دیا کہ یوں

گھر سے مرے کدھر گئے، رازِ دل اپنا کچھ کہو
کہتے ہو تم کہ یوں گئے، اور یہ نقشِ پا کہ یوں

شکوے بہت ہیں، وقت کم، تند ہے یار، میں خموش
فکر ہے آج بزم میں یوں کہوں ماجرا کہ یوں

میں نے کہا کہ بزم سے کیونکر اٹھائے گا وہ شوخ
محفلِ دل سے عیش کو غم نے اٹھا دیا کہ یوں

غمزۂ چشم کا سبق بھول گیا ہے دل مرا
روزنِ در سے جھانک کر یاد اسے دلا کہ یوں

بھول گئی بہار میں نغمۂ درد عندلیب
حافظِ خستہ جاں تو ہی نالۂ دل سنا کہ یوں

مسیح الملک حکیم اجمل خان حافظ دہلوی

دیکھتے ہیں آج اُس بُت نازک بدن کے پاؤں

گھر میرا اور اُس بتِ گل پیرہن کے پاؤں
پھرنے لگے خزاں پہ بہارِ چمن کے پاؤں

کھینچے نہ میری دشت نوردی کا کچھ خیال
دیکھنے لگیں گے آپ سے نازک بدن کے پاؤں

فی الجملہ سرخوشی سے ہے مطلب تو مے ہو کیوں
دھو کر پیوں گا ساقیٔ گل پیرہن کے پاؤں

گھر سے نکل کے دیکھیے پڑتے ہیں یہ کدھر
گُل کیا کھلاتے ہیں بتِ غنچہ دہن کے پاؤں

اپنے کیے پہ اُس کو ندامت ہے اس قدر
تر اشکِ غم سے ہو گئے شمعِ لگن کے پاؤں

بڑھتا ہے آج دستِ تصوّر خدا کرے
چھو لے کہیں وہ زلفِ شکن در شکن کے پاؤں

چلتے رہے ہیں یہ پئے آزار رات دن،
اِک دن رہیں گے ٹوٹ کے چرخِ کہن کے پاؤں

شیدا! نہ دیکھ اس کی طرف بزم میں کہ پھر
پھیلیں گے اور بھی نگہِ پُرفتن کے پاؤں

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں شیدا دہلوی

۶۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا (غالب)

حُسن کیا ہے، ایک پرتو ہے تری تنویر کا
معصیت کیا ہے، مگر سایہ اسی تصویر کا

مِٹ گیا آخر بُرا ہو نالۂ شب گیر کا
وہ جو تھا اِک رابطہ تعزیر سے تقصیر کا

حسن اِک حربہ ہے کاری وار ہے تقدیر کا
عاشقی حیلہ ہے اِک سرشکرِ تدبیر کا

آنکھ اب تک دیکھتی ہے لب ترے ہلتے ہوئے
کان لیتے ہیں مزا اب تک تری تقریر کا

میرے دم سے اِک جنوں آباد ہے زندانِ عشق
خندۂ وحشت اِدھر شیون اُدھر زنجیر کا

میرے دِل کی آگ جاپکی جہنم کی طرف
ورنہ میں قائل نہ تھا تقصیرِ بے تعزیر کا

مدعائے شرحِ دردِ دل ہے شرحِ دردِ دل
آہ کرتا ہوں مگر طالب نہیں تاثیر کا

ڈاکٹر تاثیر (مرحوم)

ع: برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم (غالب)

سن چکے ہیں طور و موسیٰ کا بہت افسانہ ہم
اب پکاریں کیا تجھے اے جلوۂ جانانہ ہم

شکوۂ پیرِ مغاں کرتے ہیں آزادانہ ہم
میکدے میں ہیں شریکِ گردشِ پیمانہ ہم

ناخدا سے کیا کہیں اے ہمتِ مردانہ ہم
کیوں نہ کشتی ڈال دیں طوفاں میں بیباکانہ ہم

کیجیے کب تک گوارا اہلِ کعبہ کا سکوت
بے محابا کھٹکھٹاتے ہیں درِ بت خانہ ہم

منحصر پرواز پر ہے آب و دانہ کی تلاش
گلستاں میں کیوں رہیں پابندِ آب و دانہ ہم

دل شکستہ ہی ہمیں اب آپ رہنے دیجیے
از سرِ نو کیا کریں تعمیرِ ماتم خانہ ہم

شمع خود بے نور ہو جائے گی ہنگامِ سحر
کیا کریں گے امتحانِ جرأتِ پروانہ ہم

خاتمہ بالخیر، تکلیفِ سماعت کیجیے
آج انور چھیڑتے ہیں آخری افسانہ ہم

لطیف انور
(مرحوم)

ع: یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں (غالب)

○

اپنی نظر سمجھ کے تمہاری نظر کو میں
تکمیل دے رہا ہوں جنوں کے اثر کو میں

اب کیا گلہ کروں ستمِ روزگار کا
پاتا ہوں اپنی سمت کسی کی نظر کو میں

ٹھہری رہے گی بات تیرے التفات پر
ہاں جانتا ہوں گردشِ شام و سحر کو میں

ساحل بھی ناگزیر تلاطم بھی ناگزیر
رُخ پھیر دوں سفینہ کا یارب کدھر کو میں

محفل میں بار بار یونہی دیکھتے رہے
میری نظر کو غیر، تمہاری نظر کو میں

میرے بغیر صبحِ گلستاں اُداس ہے
بھولا نہیں ہنوز غمِ بال و پر کو میں

میرے جنونِ سجدہ کا انجام ہو بخیر
کعبہ بنا رہا ہوں ترے سنگِ در کو میں

انور شریکِ حال ہے محکم کا التفات
کیوں داد دوں نہ اپنے کمالِ ہنر کو میں

لطیف انور

محکم۔ سردار محکم سنگھ ایڈووکیٹ گورداسپوری۔

ع :۔ بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا (غالب)

حوصلہ نکالے گی سنتے ہیں خزاں اپنا
اس لئے سنوارا ہے ہم نے گلستاں اپنا

کل چمن میں کھیلیں تھیں بجلیاں نشیمن سے
بجلیوں سے کھیلے گا آج آشیاں اپنا

بدلی سے سنتے ہیں وہ اگر تو کیا غم ہے
رنگ لے ہی آئے گی میری داستاں اپنا

آنکھ جب کھلی تو ہم گوشۂ قفس میں تھے
کتنا سچ ہوا ثابت خوابِ آشیاں اپنا

دل کی خستہ حالی پر دکھ نہ ہو ہمیں کیوں کر،
ہم سمجھتے آئے ہیں غیر کا زیاں اپنا

ہم نے صاف گوئی کا یہ مآل دیکھا ہے
غیر درپئے جاں ہے اور بدگماں اپنا

منزل آشنا ہونا اور بات ہے نصرتؔ
نا شناسِ جادہ ہے میرِ کارواں اپنا

نصرت قریشی
(مرحوم)

۱۴۔ اب آبروئے شیوۂ اہلِ ہنر گئی (غالب)

بادِ صبا چمن میں عجب کام کر گئی
غنچہ ہنسا تو پھول کی خوشبو بکھر گئی

ہم کو نہیں ہے ترکِ نشیمن کا کچھ ملال
لیکن یہ غم ہے کشمکشِ بال و پر گئی

گیسو بکھر گئے یہ ترے کس کے سوگ میں
مرنے کے بعد کس کی یہ قسمت سنور گئی

اب مختصر کہو کہ شبِ مرگ کو طویل
یومِ نشور تک تو نمودِ سحر گئی

یاد آگئی اُسے مری افسردگیٔ دل
بجھتے ہوئے چراغ پہ جس کی نظر گئی

یوں میرے دل سے ذہن میں آیا ترا خیال
جیسے نسیمِ صبح اِدھر سے اُدھر گئی

الجھی ہے کائنات کے حسنِ مجاز میں
اب آبروئے چشمِ حقیقت نگر گئی

محشر سے پیشتر یہ قیامت بپا ہے کیوں
ٹوٹا ہے کوئی دل کہ جوانی ٹھہر گئی

نصرت جبینِ شوق کی آوارگی نہ پوچھ
صحنِ حرم سے تا بہ سرِ سنگِ در گئی

نصرت قریشی (مرحوم)

بازگشت

○

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدّعا مجھے

(غالب)

ع :- موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا (غالب)

○

ہونے والا ہے چمن میں جشن، دار و گیر کا
ہر روش پر رقص دیکھیں تو سہی نخچیر کا

بہکے بہکے سے خیالوں میں اُمنگوں کا جمال
عکس پانی پر ہو جیسے چاند کی تصویر کا

لا کہیں سے تربیت گاہِ نظر کا آفتاب
زائچہ ہم بھی بنائیں صبح کی تقدیر کا

کوئی فانوسِ تمنّا ہے نہ شمعِ آرزو
شب بھیگے سنّاٹے میں ہے غم آشنا دلگیر کا

ذوقِ آوارہ نے تزئینِ ہنر کو چھین کر
روند ڈالا نقش میرے خواب کی تعبیر کا

میں خرد نا آشنا ہوں تو جنوں نا آشنا
سوچتا ہوں کیا بنے گا ذہن کی جاگیر کا

پارہ پارہ ہو گیا ہے آج دامانِ وفا
جانے کیا پہلو ہے اس تخریب میں تعمیر کا

خانقہ ہو، مدرسہ ہو، میکدہ ہو یا حرم
حُسنِ فطرت یہ مُرقّع اور تری تشہیر کا

طبعِ جولاں حضرتِ عاطرؔ قیامت ڈھا گئی
شوخیِ گفتار، غالبؔ معتقد تھا میرؔ کا

عاطرؔ ہاشمی

ع ۱۔ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا (غالب)

سوچنے کی بات ہے موقع نہیں تقریر کا
سر قلم ہوتا رہا شمشیر سے شمشیر کا

سامنا کرنا پڑے گا گردشِ تقدیر کا
اور کیا ہوتا نتیجہ آہِ بے تاثیر کا

سوچتا ہے ہر کوئی اپنی جگہ اپنی طرح
حشر ہوتا ہے بھیانک نالۂ شب گیر کا

معترض ہوتی ہے دُنیا مشتعل ہوتے ہیں لوگ
مرحلہ آساں نہیں ہے کام ہے تعمیر کا

کہہ رہا ہے آپ کے رحم و کرم کی داستاں
دیکھئے پھر دیکھئے چہرہ مری تصویر کا

ہم سے دیوانوں کی وحشت منتشر ہے ہر طرف
سلسلہ ہوگا کہاں تک حلقۂ زنجیر کا

آپ کی اپنی نظر میں ہیں مرے شام و سحر
پھر کوئی پہلو نکلتا ہے مری تقصیر کا

محمود شارب

ع :- نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا (غالب)

○

کھل سکا حلقہ نہ جس سے زلف کی زنجیر کا
وہ نکالیں گے بھلا کیا بل مری تقدیر کا

آپ سے شکوہ ہے کوئی اور نہ قسمت سے گلہ
ہاتھ ناکامی میں اپنی ہے مری تدبیر کا

پھر مری دنیائے دل میں اک سکوں سا ہو گیا
پھر ذرا اپنی نظر سے کام لیں نا تیر کا

دورِ جام آتے ہی میرے ہاتھ تھرانے لگے
کیا ٹھکانہ ہے بھلا اس گردشِ تقدیر کا

ہے علاجِ زخمہائے خنجر و نشتر، مگر
زخم بھر سکتا نہیں الفاظ کی شمشیر کا

کاش ایک اک حرف بن جاتا لبِ فریادِ غم
کاش وہ مطلب سمجھ لیتے مری تحریر کا

مجھ پہ دنیا کے تلوّن کا اثر ہو کے رہا
رنگ پھیکا پڑ گیا عالم مری تصویر کا

سیّد عالم واسطی

۴:- دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا (غالب)

ہر اک شجر تمہارے خیاباں کا سرد تھا
اِس شہرِ دلِ فگار کا سورج ہی زرد تھا

بارش ہوئی تو ریت کی بوندیں برس پڑیں
ابرِ بہار جیسے کہ صحرا نورد تھا

چمکی جو برق سارا بدن جگمگا اُٹھا
بادل میں جانے شعلہ فشاں کس کا درد تھا

کس سے کریں ہم اپنی تباہی کا تذکرہ
سنتے ہیں اِس دیار میں بس ایک فرد تھا

جب تک کھلی نہ اُن کے تصوّر کی چاندنی
ہر ایک شخص اپنے خیالوں کی گرد تھا

شفقتؔ یہ دل فریب ستاروں کی روشنی
گزری ہے جس کو چھو کے وہی پھول زرد تھا

شفقت بٹالوی، لائلپور

ع۔ محرم نہیں ہے تُو ہی نواہائے راز کا (غالب)

○

عالم فریفتہ ہے اسی عشوہ ساز کا
دیکھو تو رنگ جلوۂ حسنِ مجاز کا

اب وہ نگاہِ شوق سے رہتے ہیں بدگماں
یہ ہے مآلِ عشقِ دلِ پاکباز کا

نغماتِ سوزِ غم سے ہے لبریز اے ندیم
اچھا نہیں ہے چھیڑنا اِس دل کے ساز کا

مجھ پر نظر عتاب کی ہو یا نگاہِ لُطف
مجھ میں جنوں میں ہوش نہیں امتیاز کا

اِک برق مضطرب ہے دلِ بے قرار میں
اُٹھتا ہے پھر حجاب حرم گاہِ ناز کا

اب رنگِ اضطراب میں باقی نہیں ہے ضبط
اب مجھ میں حوصلہ نہیں اخفائے راز کا

عشقِ جنوں نواز کا احسان دیکھیے
اکبرؔ کو ہوش کب ہے نشیب و فراز کا

جلال الدین اکبر

ع : جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا (غالب)

کوئی تو مجھ کو ڈبونے کے لئے بیتاب تھا
موجۂ طوفاں تھا یا وہ حلقۂ گرداب تھا

اس کو ہم نے خود نظر انداز یا رو کر دیا
جو ہماری داستاں کا اِک سُنہری باب تھا

ظلمتوں کے شہر میں بھی جو درخشندہ رہا
وہ حقیقت کا اُجالا پیار کا مہتاب تھا

رات جب جھانکا تری یادوں کے جھرمٹ میں کچھ پرے
دُور تک پھیلا ہوا اِک نور کا سیلاب تھا

دِل کے صحراؤں میں دیکھو تو پتا چلتا ہے آج
پھول کھلتے تھے یہاں اِک دن چمن شاداب تھا

آتشِ احساس سے جلتے تھے ہم چپکے یہاں
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

کوئی بھی درد آشنا خالد نہیں تھا شہر میں
ویسے کہنے کو تو کافی حلقۂ احباب تھا

خالد شفیق

۷ء۔ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا (غالب)

○

تیرے جلوے سے مرے دل کا فروزاں ہونا ایک ذرّے کا ہے خورشید بداماں ہونا
جب کسی غنچے کا مُنہ چومتی ہے موجِ نسیم یاد آتا ہے ترے لب کا گلستاں ہونا
جیسے وہ جلوہ بقدرِ طلبِ شوق نہیں دل کی لغزش پہ نگاہوں کا پشیماں ہونا
کس کو فرصت ہے کہ ہر ُتربت کا جگر چاک کرے ورنہ مشکل تو نہ تھا کفر کا ایماں ہونا
اب کہاں جاؤں یہ آشوبِ تمنّا لے کر درد کو آگیا مضرابِ رگِ جاں ہونا
یہ بھی منجملۂ اندازِ مسیحائی ہے میرے غم کا ترے چہرے سے نمایاں ہونا
آپ ہی دیکھنا آئینے میں اپنا چہرہ آپ ہی اپنی تجلّی سے پریشاں ہونا
سانس لینے کو مسافر کی طرح ٹھہرے تھے ہائے اُس سایۂ دیوار کا زنداں ہونا

غیرتِ جوشِ جنوں کے لئے نشتر ہے جمالؔ
وحشتِ عشق کا ہم چشمِ غزالاں ہونا

جمالؔ ۔ سُویدا

میری قسمت میں ہے نذرِ غمِ ہجراں ہونا
تم نہ انجامِ محبت سے پریشاں ہونا

دستِ وحشت نے یہ اعجاز دکھایا تو سہی
میرے دامن کو مبارک ہو گریباں ہونا

چوٹ سی دل پہ لگاتا ہے تری فرقت میں
چند تاروں کا سرِ شام نمایاں ہونا

یہ تمنّا ہے کہ جب لوگ مجھے دفن کریں
تم بھی موجود سرِ گورِ غریباں ہونا

کر گیا اور بھی مجروح مجھے اُلفت میں
ظلم کے بعد ستم گر کا پشیماں ہونا

ڈگمگاتے نہیں مسرُورؔ وفا کے بندے
کفر ہے راہِ محبّت میں ہراساں ہونا

مسرُورؔ صابری

ع :۔ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا (غالب)

دل کے داغوں کا شرارِ فروزاں ہونا
یہ بھی اِک طرح کا ہے جشنِ چراغاں ہونا

نہ تبسم کا شرارہ، نہ تکلم کی بھڑک
قہر ہے دل کا چراغِ تہہ داماں ہونا

آجکل جبکہ ہر انساں ہے پریشاں خاطر
کون دیکھے ترے گیسو کا پریشاں ہونا

نہ کہیں بادِ بہاری، نہ کوئی تازہ کلی
صاف ظاہر ہے گلستاں کا بیاباں ہونا

نقش برآب ہوئیں ساری اُمیدیں دل کی
سخت مشکل ہے کوئی صورتِ امکاں ہونا

شوخ جذبوں کی نمائش کا پتا دیتا ہے
تیرا ملبوس کے پردے میں بھی عریاں ہونا

نہ وہ اسلوبِ سخن ہے نہ وہ ماحولِ خلش
طرزِ غالب میں قیامت ہے غزل خواں ہونا

خلش ہاشمی

ع :- آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا (غالب)

O

تیرے ہر قطرے کو اِک روز ہے طوفاں ہونا
چشمِ حسرت تجھے زیبا نہیں گریاں ہونا

رات کٹتی ہے نہ طے ہوتی ہے راہِ الفت
پھر بھی ہے منتظرِ صبح درخشاں ہونا

خوں رُلائے گا یہی تجھ کو کسی دن اے دل
رنگ لائے گا ترا بندۂ ارماں ہونا

کہے دیتا ہے یہ ان مُنھ بندھی کلیوں کا نکھار
اِن کی تقدیر میں ہے جانِ گلستاں ہونا

دل کے پیمانے میں ہے خونِ جگر مثلِ شراب
ہے اِسے گردشِ تقدیر کا عنواں ہونا

ہم خزاں بختوں کو کیا کام گلستاں تجھ سے
تجھ کو منّت کشِ ہر فصلِ بہاراں ہونا

چُبھتی ہی رہتی ہیں دل میں مرے نشتر بن کر
سُوئیاں وہ جنھیں حاصل تری مژگاں ہونا

انیسؔ اعجازی چیاگانگ

مصرع: تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا (غالب)

میرے ہر داغِ جگر کا جلوہ بے اندازہ تھا
اس گلستانِ خزاں منظر میں ہر گل تازہ تھا

پے بہ پے لاکھوں جہانِ آرزو غارت ہوئے
ہر نفس میرا شبِ غم رُستخیز اندازہ تھا

حادثاتِ دہر سے خود منتشر ہوتا گیا
دل کہ اجزائے کتابِ عشق کا شیرازہ تھا

جس پہ مُردوں کو ہوا صورِ قیامت کا گماں
وہ کسی درویشِ کوچہ گرد کا آوازہ تھا

بابِ جنت پر پہنچ کر میں بہت حیراں ہوا
میکدے کے در سے ملتا جُلتا وہ دروازہ تھا

کس کی سر مستی فضاؤں میں سمو کر رہ گئی
عالمِ امکاں کس معشوق کا خمیازہ تھا

اے تبسّم! حشر میں عشاق ہی ٹھہرے حسیں
اُن کے چہروں پر غبارِ کوئے جاناں غازہ تھا،

عبدالرشید تبسم، ایم اے

ع :- تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا (غالب)

جو ستم کشوں کا مدفن سرِ رہگزار ہوتا / اِسی طرح تا قیامت غمِ انتظار ہوتا

شبِ غم زباں سے یارب کبھی وہ صدا نہ نکلی / جسے سُن کے خوابگہ میں کوئی بیقرار ہوتا

ہے فروغِ ماہ شب بھر ہے بہارِ باغ دو دن / تری دوستی پہ کیونکر مجھے اعتبار ہوتا

مرا دل غنی نہ ہوتا کبھی دولتِ جہاں سے / ترے غم میں میرا دامن جو نہ تار تار ہوتا

اِسے رائیگاں نہ سمجھو، یہ نفس عجیب شے ہے / تب و تابِ عشق رکھتے تو یہی شرار ہوتا

غمِ عشق وہ بلا ہے کہ جو مہر و ماہ نہ ہوتے / تو فلک پہ شعلہ بن کر یہ غمِ آشکار ہوتا

ترے غم میں جان دیدی تو یہ کونسی خطا کی / کسی در پہ سر جھکاتا تو گناہگار ہوتا

جو سکوں کسی قدر ہے تو وفورِ یاس سے ہے / جو امیدِ وصل ہوتی تو کسے قرار ہوتا

جو نظیر اس کے دل میں نہ خدا نے رحم ڈالا

تو مجھے ہی میرے دل پر کوئی اختیار ہوتا

نظیر لدھیانوی

ع :- یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا (غالب)

○

جو تری طلب سے خالی دلِ داغدار ہوتا
تو جہانِ زندگی میں عجب انتشار ہوتا

تری بزمِ ہاؤ ہو میں یہ سکوتِ خانقاہی
کہیں نعرۂ انا الحق، کہیں ذکرِ دار ہوتا

ترے غم کی لذتوں سے اسے شاد کام کرتے
ہمیں اپنی زندگی پر اگر اختیار ہوتا

یہ ڈھلک پڑا تو شبنم کا حقیر سا اک آنسو
تھا گہر جو جلوہ افگن سرِ نوکِ خار ہوتا

جو میسر اس کو آتے کسی طور اشکِ بلبل
یہی مضمحل شگوفہ گلِ نو بہار ہوتا

ترے وعدے پر نہ آیا ہمیں اعتبار ورنہ
پسِ مرگ ناگہاں بھی ترا انتظار ہوتا

ہوں وہ خوش نصیب زیدیؔ کہ پیا ہے جامِ کوثر
تھا کہاں مرا ٹھکانہ جو میں بادہ خوار ہوتا

نظر زیدی

ع: ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا (غالب)

○

بدلتا ہے زمانہ رنگ کیا کیا جو تم ہو ساتھ تو اچھا بُرا کیا
نہ کچھ حاصل ہو جس سے التجا کیا جو محرومِ اثر ہو وہ دعا کیا
وفا کے بھیس میں اُن کی جفائیں خدا جانے دکھائیں اور کیا کیا
تڑپ دل کی زیادہ ہو رہی ہے وہ آئے پوچھنے کو مدعا کیا
نہیں اخلاص کی قیمت جہاں میں کسی مجبورِ اُلفت کی وفا کیا
بدلتی جا رہی ہیں ان کی نظریں کسی نامعتبر کا آسرا کیا
کہا کب ہم نے ان سے حالِ اپنا پھر ان کی بے نیازی کا گلا کیا
بڑھایا کرب نے احساسِ لذت نہ ہو رہزن تو قدرِ رہنما کیا
حقیقت بن رہی ہو جب فسانہ سمجھ میں آئے پھر وہ ماجرا کیا
علاوہ غم جو جان آرزو ہے ہمیں پھر ہو مقدر سے گلا کیا
کنارہ کر رہے ہیں دوست دشمن ہماری بے کسی کا پوچھنا کیا

ابھی تو ہے شروعات اس کی کسریٰؔ
دکھائے اور دورِ ابتلا کیا

کسریٰ منہاس، لاہور

ع:- "ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا" (غالب)

○

دلِ صد چاک کی آہ و بکا کیا
شکستہ ساز کیا اس کی صدا کیا

نقوشِ جادۂ منزل ہیں ناصح
وگرنہ زہد کیا ہے اتقا کیا

مقامِ بندگی سے بھی ہے غافل
خودی میں جو یہ کہہ بیٹھے خدا کیا

چمن والو! تم اپنی خیر مانگو
قفس والوں کا گھر کیا تھا جلا کیا

تمہیں سے تم کو چاہیں اللہ اللہ!
ہمارا ظرف کیا ہے مدعا کیا

ہجومِ رونقِ ہستی میں گم ہے!
رہِ گم کردہ ہے یہ رہنما کیا

ذرا سی لغزشِ دل کا مقدر!
دھرا کرتی ہے دنیا نام کیا کیا

اہانت، جبر، دشنام و ملامت
یہی ہوتا ہے انجامِ وفا کیا

برا ہے یہ تصور تیرا صیاد!
اسیرانِ قفس کا حوصلہ کیا

یونہی بدنام کرتے ہو کسی کو
ذرا بتلاؤ تو کس نے کہا کیا

غزل بہر غزل ہے بعد غالب
خیال ہے اس فن میں اب باقی رہا کیا

عبدالوحید خاں
ہاشمی

۱۷۔ درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا (غالب)

○

ہم سا جب اپنے کو پہچاننے والا نہ ہوا
عارفِ ذات، ہم ایسا کوئی پیدا نہ ہوا

اور دیوانے کو دیوانہ بنانے کے لئے
غیر دیوانہ بنا جب کہ میں دیوانہ ہوا

کہیں زحمت میں نہ پڑ جائیں مرا دل لے کر
کیا بھلا ہو گا کسی کا جو ہمارا نہ ہوا

کل کا وعدہ تھا مگر آج بھی وہ آئے نہیں
وعدۂ حشر ہوا وعدۂ فردا نہ ہوا

صبح ہونے ہی کو ہے رات گئی بات گئی
ہائے کیا وعدۂ محکم تھا کہ پورا نہ ہوا

خاکِ پروانہ ہوا، شمع کو پروا نہ ہوئی
کیمیا جوہرِ خاکِ پرِ پروانہ ہوا

فاقہ مست اور تغزل کی قلمرو کا رئیس
صاحبِ مُہر و قلم مجھ سا پیدا نہ ہوا

مہر جائسی

ع:۔ اِک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا غالبؔ

میری آشفتگی سے کیا نہ ہوا
ایک اظہارِ مدعا نہ ہوا

اس کو دِل دے کے رو رہا ہوں میں
جو کبھی درد آشنا نہ ہوا

ظلمتِ شب نے لوٹ لیں کرنیں
قرض کیا صبح کا ادا نہ ہوا

ذوقِ نظّارۂ تصوّر کیا
کوئی آغوشِ گل بھی وا نہ ہوا

اپنی دیوانگی بھی سر افلاک
اُن کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا

دِل کو ہے عفّتِ گہر کی تلاش
ایک آنسو بھی دیر پا نہ ہوا

کب سے عاطرؔ ہے گوش بر آواز
کوئی چرچا خلوص کا نہ ہوا

عاطِر ہاشمی

ع۔ وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا (غالب

کسی صورت کسی عنواں تو عرضِ مدعا ہوتا
زباں کو چپ لگی تھی گر تو آنکھوں نے کہا ہوتا

مجھے دل صانعِ قدرت، کوئی ایسا عطا ہوتا
نہ جس میں آرزو ہوتی نہ جس کا مدعا ہوتا

بلا سے دار پر مجھ کو چڑھا دیتے جہاں والے
مگر حق بات کہنے کا تو مجھ میں حوصلہ ہوتا

مٹا کر اپنی ہستی کو درِ جاناں کی عظمت پر
میں سجدہ ریز بھی ہوتا اگر سجدہ روا ہوتا

شکایت غیر سے لازم نہ تھی تم کو کسی صورت
جو شکوہ مجھ سے تھا کوئی، تو مجھ ہی سے کیا ہوتا

زمانہ لاکھ کرتا بے وفائی عمر بھر مجھ سے
مگر اے دوست تیرے دل میں تو پاسِ وفا ہوتا

تجھے بھی داد مل جاتی ترے جذبِ محبت کی،
ترے پہلو میں آتش گر دلِ درد آشنا ہوتا

آتش رُوحانی

ع :- کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا (غالب)

دل کا وہ سلسلہ، نہ وہ شیوہ دماغ کا
یہ رنگِ انقلاب ہے دُنیا کے باغ کا

وہ ابتدائے شوق کی خوش فہمیاں کہاں
اب ماند پڑ گیا ہے وہ شعلہ چراغ کا

بزمِ جہاں کی زیب و ضیاء مستعار ہے
انجام ایک ہی سا ہے باغ اور راغ کا

یہ زندگی مجھے بڑی بے کیف سی لگی
آیا خیال جب ترے غم سے فراغ کا

اِک عمر اپنے آپ کو ہم ڈھونڈھتے رہے
انساں فریب خوردہ ہے اپنے سراغ کا

اِس مے کدے میں ظرف کا معیار الگ الگ
ہر بادہ خوار یوں تو ہے طالب ایاغ کا

بزمیؔ، مرے کلام کا اپنا ہی رنگ ہے
میں معتقد نہیں ہوں امیر اور داغ کا

خالد بزمی

ع: سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا (غالب)

آج پھر وہ گلِ تر یاد آیا
راحتِ قلب و نظر یاد آیا

پھر ہوئی بادِ بہاری رقصاں
دِل کو پھر اِک گلِ تر یاد آیا

سنگِ طفلاں کا ہدف بننے کو
غیر کیا اپنا ہی سر یاد آیا

آنے والی ہے کوئی تازہ بلا
اُن کو یہ خاک بسر یاد آیا

اب کہاں صبر و تحمّل دل کو
پھر وہی شوخ نظر یاد آیا

خانۂ دل کی نہ تعمیر ہوئی
ہائے اپنا نہ نگر یاد آیا

جس نے رخشاںؔ کو فراموش کیا
وہی ہر شام و سحر یاد آیا

رخشاں ابدالی

ع:- پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا (غالب)

شام یاد آیا سحر یاد آیا
وہ مجھے آٹھوں پہر یاد آیا

اُس کی یادوں میں یہ جادو دیکھا
بھولنا چاہا مگر یاد آیا

دیکھئے اُس کا تغافل کہ مجھے
کوئی دیوار نہ در یاد آیا

لُٹ گئی جس میں سکوں کی دولت
پھر وہ منزل وہ سفر یاد آیا

دل میں پایا ہے چراغوں کا سماں
جب بھی وہ شعلہ نظر یاد آیا

کس نے دروازے پہ دستک دی ہے
میں کسے وقتِ سحر یاد آیا

دیکھ کر رنگِ جہاں رضوانیؔ
رتبۂ اہلِ بشر یاد آیا

تبسم رضوانی

ع :- سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گُل نا آشنا (غالب)

حُسن کی طالب نگاہیں، دِل تمنّا آشنا
زندگی لائی ہے اپنے ساتھ کیا کیا آشنا

حُسنِ گُل میں ہو کہ شعلے میں تڑپ اُٹھتا ہے دِل
تم نے باندھا ہے مرے مَن سے اچھا آشنا

چاندنی ہے آؤ بھی سائے میں چھپ بیٹھیں کہیں
کون پہچانے گا آخر کون اتنا آشنا

خواب ہو کر رہ گئی ہیں کیسی کیسی صحبتیں
داغِ فرقت دے گیا ہے کیسا کیسا آشنا

روز بن جاتا ہے اُن کا حسن موضوعِ کلام
اِک قیامت روز کر دیتے ہیں برپا آشنا

جیسی نیّت، ویسا پھل، جیسی طلب، ویسی مراد
ایک صف میں ہیں یہاں کیا اجنبی کیا آشنا

جانے کتنے دوست اُس محفل میں ہیں کتنے حریف
ہم مگر اُن کی طبیعت سے ہیں تنہا آشنا

ہم غریبوں کی محبّت کو حقارت سے نہ دیکھ
اس زمانے میں کہاں ہوتا ہے پیدا آشنا

ان کے حلقے میں مری بیتابیوں پر تبصرے
اور اس دلچسپی سے میں آج تک نا آشنا

کس طرف جائیں کہاں نکلیں کہ ہم رُسوا نہ ہو
ہم تو دیوانے ہیں دیوانوں سے دُنیا آشنا

حشر سے ڈرتے ہو دانشؔ بزمِ دُنیا سے ڈرو
نفسی نفسی ہے یہاں بھی کون کس کا آشنا

احسان دانش

ع:- درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا (غالب)

○

جرمِ تسلیم محبت کی سزا ہو جانا
تم بھی بیگانۂ تعمیلِ وفا ہو جانا

سر پہ سورج ہو تو سایہ بھی سمٹ جاتا ہے
تم بھی کل تک کوئی گم گشتہ صدا ہو جانا

زخم کے پھول کھلے ہوں تو بھلے لگتے ہیں
تم بھی زخموں کے لئے موجِ صبا ہو جانا

دِل کی راہوں میں رواجوں کے کڑے پہرے ہیں
اب تو مشکل نہیں اِنساں کا خدا ہو جانا

روح سانسوں کی حرارت سے جلا پاتی ہے
آج سانسوں سے قریب اور ذرا ہو جانا

اب تمنّا ہے کہ اظہارِ تمنّا کر دیں
ہاں مگر تم ذرا تصویرِ حیا ہو جانا

زندگی کا نیا مفہوم نکل آئے گا،
مسکراتے ہوئے ضیغمؔ سے جدا ہو جانا

ضیغم حیدری

ع :- کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست (غالب)

چٹکیاں لیتی ہے دل میں حسرتِ دیدارِ دوست
یاد ہے اب تک مجھے وہ لذتِ انکارِ دوست

کون ہوگا آشنائے لذتِ دیدارِ دوست
کون ہوگا مبتلائے اُلفتِ آزارِ دوست

حُسن کی جادوگری کی تاب لا سکتا ہے کون
یا نگاہِ حشر ساماں، یا دلِ بیمارِ دوست

دِل سے کیوں کر محو کر دوں لذتِ سُود و زیاں
غیرتِ خلدِ بریں ہے رونقِ بازارِ دوست

اُس سے بڑھ کر کون ہوگا اور قسمت کا دھنی
ہو میسّر جس کو ہمدم سایۂ دیوارِ دوست

جیسے دل کا راز غیروں سے کہا جاتا نہیں
دوستوں سے چھپ نہیں سکتے یونہی اسرارِ دوست

چھٹ گئی ظلمت، اُجالا ہو گیا ہر سو عزیزؔ
دیکھئے یہ ہے طلسمِ پرتوِ انوارِ دوست

عزیز لودھیانوی

ع: سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج (غالب)

سرمایۂ نشاط و بہارِ نظر ہے آج
دل جس کو چاہتا تھا وہی جلوہ گر ہے آج

اِنسانیت کی سمت سے صرفِ نظر ہے آج
جو قدر معتبر تھی وہ نامعتبر ہے آج

آنسو بہا کے یاد میں تیری ہوا یہ سُود
دامن میں اپنے کیا نہ لعل و گہر ہے آج

شہرہ اُسی کے حُسن کا پھیلا ہے ہر طرف
شہرت کے چرخ کا وہی شمس و قمر ہے آج

ہے کیا بہارِ نقشِ کفِ پائے یار کی
کیسا کھِلا چمن سا سرِ رہگزر ہے آج

اِک کوچہ ہے، کہ ہے اسی جانب رجوعِ خلق،
سب کی مراد ایک وہی سنگِ در ہے آج

سرشار فکرِ دوست جو رخشاں بنا یہ دل
رنج و ملال حلقۂ بیرونِ در ہے آج

رخشاں ابدالی

۴۷۔ اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ (غالب)

جنوں میں شکلِ عقیدت نہ یوں جبیں پر کھینچ
دلوں پہ نقشِ محبت بنوکِ نشتر کھینچ

مذاقِ سجدہ ہے جن کو نگاہ نے ان کی
صنم کدوں سے لیے ہیں عظیم پتھر کھینچ

کہاں ہیں منزلِ مقصود جن کی مقتل تھا
فرازِ دار سے تصویرِ عزمِ رہبر کھینچ

حسینِ سحر کی جبیں میں بھی ہے نہاں ظلمت
بڑھا کے ہاتھ ذرا شب کے سر سے چادر کھینچ

کمالِ اہلِ قفس پر ہے ہر کلی نازاں
لیا ہے اہلِ چمن کو قفس کے اندر کھینچ

کمی نہیں ہے جہاں میں جفا شعاروں کی
مری وفاؤں کا نقشا مجھے مٹا کر کھینچ

جہاں ملال نہ ہو بستیاں اُجڑنے کا
دلوں کے حال کا عامرؔ وہاں نہ منظر کھینچ

عامرؔ سناحی

ع ؎ حُسن غمزے کی کشاکش سے چُھٹا میرے بعد (غالب)

⭘

نہ رہا اب کوئی پابندِ جفا میرے بعد
اِس پہ روتا ہے ہر اک اہلِ وفا میرے بعد

قدرداں کوئی بتوں کا نہ رہا میرے بعد
کعبہ اِس غم میں سیہ پوش ہوا میرے بعد

مجھ سے جاری ہوئی دیوانگیٔ عشق کی رسم
قیس بھی عشق میں دیوانہ ہوا میرے بعد

پیاس کانٹوں کی سرِ دشت بجھائی جس نے
نہ ہوا ایسا کوئی آبلہ پا میرے بعد

ظلم سہہ کر بھی کیا شکر، شکایت کیسی
ہے کوئی خوگرِ تسلیم و رضا میرے بعد

نہ وہ موسم طرب افزا نہ بہاروں کا گزر
ناموافق ہوئی گلشن کی فضا میرے بعد

یہ تعلّی نہیں غالب کی زمیں میں نازشؔ
پھر غزل ایسی کوئی کہہ نہ سکا میرے بعد

نازشؔ رضوی

ع:۔ کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد (غالب)

پھر کسی سر میں یہ سودا نہ اُٹھا میرے بعد
پھر کسی نے بھی انا الحق نہ کہا میرے بعد

دشتِ غربت میں کوئی بھی نہ رہا میرے بعد
بے کسی اور بڑھی حد سے سوا میرے بعد

کہہ کے یہ بحرِ حوادث میں کوئی ڈوب گیا
اب نہ اُٹھیں گی یہ امواجِ بلا میرے بعد

چار تنکے ہیں نشیمن کی حقیقت کیا ہے
شاخِ گلشن سے اُڑا دے گی ہوا میرے بعد

پھر کسی آنکھ نے ٹپکائے نہ جلتے آنسو
بزمِ حسرت میں چراغاں نہ ہوا میرے بعد

کیا ہوئے وہ جو ہوئے بعد میں مائل بہ کرم
خاک برسے گی جو برسے گی گھٹا میرے بعد

رنگ بھر دے گی فضاؤں میں اُداسی مسرور
جو بھی گونجے گی مرے دل کی صدا میرے بعد

مسرور صابری

ع ۱۔ کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد (غالب)

تو نے دیکھا ہے اگر شہرِ وفا میرے بعد
یہ بتا کون ہوا نذرِ قضا میرے بعد

لوگ گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں بازاروں میں
کس کا پھر چاک گریبان ہوا میرے بعد

آ ہی نکلا ہوں میں بھولے سے تو پتھر مت پھینک
کون پھر دیگا ترے در پہ صدا میرے بعد

تجھ پہ کھل جائے گا سب حسنِ صداقت کیا ہے
تو بھی اِک نعرۂ مستانہ لگا میرے بعد

میں ترے عشق میں بدنام ہوا کچھ تو ہوا
آج تک پھر کوئی کافر نہ ہوا میرے بعد

حسنِ تخلیق تخلیل کے سوا کچھ بھی نہیں،
سوچتا ہوگا یقیناً یہ خدا میرے بعد

ہائے وہ روپ جو تخئیل کا حاصل نہ ہوا
ہائے وہ رنگ جو سب پہ کھلا میرے بعد

اہلِ دل یاد جب آتے ہیں تڑپ اٹھتا ہوں
جانے کس حال میں ہے شہر ترا میرے بعد

کاظمیؔ میں بھی ہوں غالب کے پرستاروں میں
اور بھی ہوں گے کئی نغمہ سرا میرے بعد

اکبر کاظمیؔ

ع :- جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر (غالب)

اقرار دیکھ کر، کبھی اِنکار دیکھ کر
دِل جل گیا ہے شوخیٔ گفتار دیکھ کر

وہ کیا گئے کہ گھر کو بیاباں بنا گئے
ڈرنے لگا ہوں اب دَر و دیوار دیکھ کر

رنگِ شفق اُڑا، رُخِ خورشید فق ہوا
اس مہ جبیں کے کاکل و رخسار دیکھ کر

صحرائے بیکراں میں اُترنا پڑا مجھے
راہِ سفر کو نقطۂ پرکار دیکھ کر

کلیاں چٹک کے غنچۂ نورستہ بن گئیں
اس شوخ کی لطافتِ گفتار دیکھ کر

ظلمت کی اوٹ میں نہ ہو رہزن چھپا ہوا
رُکنا کہیں نہ سایۂ دیوار دیکھ کر

ہر موڑ پر ہیں ظلم کے پہرے لگے ہوئے
چلنا پڑے گا وقت کی رفتار دیکھ کر

جی چاہتا ہے چھوڑ دیں یارو غزل کا فن
اِس دورِ کم سواد کا معیار دیکھ کر

رَچ بس گیا ہے ذہن میں ناصر کسی کا رُوپ
اب کیا کریں گے ہم کوئی شہکار دیکھ کر

ناصر زیدی

ع ۱- میں ہوں اپنی شکست کی آواز (غالب)

بخش دی مجھ کو شوخیِ آواز
شکریہ آپ کا غریب نواز

لذتِ لمس ہے ابھی تازہ
ابھی قائم ہے عشق کا اعجاز

ابھی ٹوٹا نہیں فسونِ نظر
ابھی بھولے نہیں ترے انداز

سامنے ہیں ابھی وہ لعل سے لب
سُن رہا ہوں ابھی وہی آواز

میری راتیں وہی طویل طویل
تیری زلفیں وہی دراز دراز

منزلِ شوق پر ہوں پا انداز
میں نہیں جانتا نشیب و فراز

ہائے اس دوستی کے پردے میں
کتنے بیگانگی کے ہیں انداز

فرصتِ یک نظر سراپا ناز
کتنا رنگین ہے طلسمِ مجاز

مبتلائے فریب رہتا ھے
آدمی کس قدر ہے دھوکے باز

دل بھی بیگانہ ہو چکا کب کا
کوئی اپنا نہیں ہے محرمِ راز

یہ بھی کوئی ہے زیست کا انداز
اپنے دل کی نہ سن سکوں آواز

اب کسی سے کوئی اُمید نہیں
آپ اپنا ہوں مونس و دمساز

لائیے اب کہاں سے آتشِ شوق؟
پائیے اب کہاں سے سوز و گداز

دل میں ہنگامہ کچھ بپا ہی نہیں
کیسے نکلے زبان سے آواز

شرطِ لازم ہے خامشی کوثر
ہاں مگر ایک آہِ سینہ گداز

جمیل کوثر

ع :- آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک (غالب)

(۸)

اِس طرف سے ترا اِک پل کو گزر ہونے تک
اِک بھرے شہر کو دیکھا ہے کھنڈر ہونے تک

آ ہی جائے گا مجھے حُسن کے منصب کا لحاظ
دل شکستہ ہوں، ترے آئینہ گر ہونے تک

جیسے صحرا میں جدھر جائیے ریت اُڑتی ہے
عمر نے ساتھ دیا صرف بسر ہونے تک

شمع تنہا تو نہیں رات سے سرگرمِ ستیز
کہ ستارے بھی تو جلتے ہیں سحر ہونے تک

سوچتا ہوں کہ قیامت ہی نہ برپا ہو جائے
تیری رحمت پہ دعاؤں کا اثر ہونے تک

اے فصیلِ عدم! اے حلقۂ اسرار — ابھی
کتنے سر چاہئیں دیوار کو در ہونے تک

دُھوپ نکلی تو مرا نغمۂ رنگیں سُننا
نالہ برلب مجھے رہنے دو، سحر ہونے تک

احمد ندیم قاسمی

ع کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک (غالب)

سخت مشکل ہے مگر لطفِ نظر ہونے تک
ایک پل چاہیئے قطرے کو گہر ہونے تک

ٹوٹ جائے گا کسی روز رفاقت کا طلسم
دل ہے وابستگیٔ حُسنِ نظر ہونے تک

تیری یادوں نے شبِ ہجر وہ افسوں پھُونکا
تھک گیا قافلۂ شوق سحر ہونے تک

درد کی لَو سے فروزاں تھا شبستانِ خیال
اِک چراغاں تو رہا رات بسر ہونے تک

کتنی صدیوں کی مسافت تھا وہ لمحہ جس میں
لاکھ خورشید ڈھلے ایک نظر ہونے تک

نغمۂ درد سے تھا تارِ رگِ جاں لرزاں
بے صدا ساز ہوا اُن کو خبر ہونے تک

خاک اُڑتی نظر آئے گی یہاں پر حافِظ
ہیں یہ سب فِتنے تری راہگزر ہونے تک

حافِظ لدھیانوی

ع ا۔ آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک (غالب)

آہ بے سُود ہے مرہونِ اثر ہونے تک
بات بنتی نہیں اشکوں کے گہر ہونے تک

وقت کی بات ہے جب وقت گیا بات گئی
ہم نہ ہوں گے شبِ ہجراں کی سحر ہونے تک

دیکھیئے ہوتا ہے کیا قلب و نظر کا عالم
کیا بنے کوچۂ جاناں میں گزر ہونے تک

اک تری چشمِ تغافل ہی نہیں باعثِ غم!
رنج کچھ اور بھی ہیں ختم سفر ہونے تک

شبِ وعدہ ہے تذبذب بھی ہے اُمید بھی ہے
کتنے ہنگامے ہیں، ہنگامِ سحر ہونے تک

حسرتیں سینکڑوں، ارمان ہزاروں شاربؔ
عمر اک چاہیئے، ہر مرحلہ سر ہونے تک

محمود شاربؔ

ع۔ آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک (غالب)

جو بھی عالم ہو اِدھر اُن کی نظر ہونے تک
اب تو جینا ہے ہمیں عمر بسر ہونے تک

دل کی دھڑکن کو ترے پاؤں کی آہٹ سمجھا
چونک اُٹھا ہوں کئی بار سحر ہونے تک

عکس ہوتا ہے بہر حال حقیقت سے قریب
سایہ بے داغ ہے دیوار میں در ہونے تک

اُن کی تقصیر نہیں میری ہی تقدیر کہو
رُخ بدل جاتا ہے نظروں کا اِدھر ہونے تک

اب ہوا علم کہ اِنسان کا دِل کیا کچھ ہے
کچھ نہ تھا تبصرۂ اہلِ نظر ہونے تک

اس سے پہلے تمہیں تکمیلِ ستم لازم ہے
جانے کیا ہو مری آہوں میں اثر ہونے تک

کتنی اُمیدوں کے خورشید نظر آئے عزیز
ایک اُن کی شبِ وعدہ میں سحر ہونے تک

نور حسین عزیز

ع: برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم (غالب)

○

کچھ حقیقت ہیں جہاں میں اور کچھ افسانہ ہم
انجمن ہم، شمع ہم، ہنگامہ ہم، پروانہ ہم

دو جہانوں میں ہے جو کچھ آؤ ہم تم بانٹ لیں
تم سنبھالو عرش و کرسی، دہر کا ویرانہ ہم

حُسن کی ہر انجمن میں دل بہت غمگیں رہا
بستیوں میں ساتھ لے آئے ہیں اک ویرانہ ہم

حُسنِ بے پروا ہو پابندِ وفا ممکن نہیں
کس طرح سمجھائیں تجھ کو اے دلِ دیوانہ ہم

ہم کو پہچانیں گے وحشی آبلوں کے خون سے
لکھ چلے صحرا میں اپنے پاؤں سے افسانہ ہم

رُک نہ سکتا تھا زیادہ دیر تک یہ حادثہ
تم تھے اک بیتاب بجلی، منتظر کاشانہ ہم

مسکرا کر اُس نے قصّہ طور کا دُہرا دیا
ہو گئے آخر کو اے دل ہوش سے بیگانہ ہم

گردشِ افلاک کا سارا اثر مٹ جائے گا
تیز اگر کر دیں تبسمؔ گردشِ پیمانہ ہم

عبد الرشید تبسمؔ

۶۵۔ جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم (غالب)

کس تمنّا پر نہ جانے بر درِ مے خانہ ہم
عمر بھر بیٹھے رہے خالی لیے پیمانہ ہم
آپ کے دم سے ہماری انجمن تھی کہکشاں
اب کہیں کس سے حدیثِ ساغر و میخانہ ہم

جب وہ ملتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے ہمیں
ہم سے ہیں بیگانہ وہ اور ان سے ہیں بیگانہ ہم
غیر کی باتوں سے آئے آپ کی آنکھوں میں اشک
ہو اجازت تو کہیں کچھ اپنا بھی افسانہ ہم

چاک ہو جائیں گی یہ تاریکیاں کچھ دن کے بعد
کر رہے ہیں دل میں پیدا جرأت رندانہ ہم
ایک مدت سے وفا کے نام پر اے ہم نشیں
پھر رہے ہیں اس نگر میں صورتِ دیوانہ ہم

دوسروں کی لَو میں جلنا ہے فہمیدہ اپنا کام
لے کے آئے ہیں ازل سے فطرتِ پروانہ ہم

فہمیدہ عباس

ع :- ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں (غالب)

آپ غیروں کو بھلا، مجھ کو برا کہتے ہیں
آپ سے کون کہے آپ یہ کیا کہتے ہیں

دل میں ہوتا نہیں جب درد تو غم ہوتا ہے
اس لئے درد کو ہم دل کی دوا کہتے ہیں

آپ جو چاہیں کہے جائیں یہ خو آپ کی ہے
اپنی عادت ہے کہ سب سُن کے بجا کہتے ہیں

داغ مہتاب کو جو چاہیں کہیں اہلِ خرد
ہم کسی شوخ کا نقشِ کفِ پا کہتے ہیں

گرچہ پاتے نہیں کچھ ان میں خموشی کے سوا
پھر بھی کچھ لوگ بُتوں ہی کو خدا کہتے ہیں

وہ جفاؤں سے نہ باز آئے تو یہ ہم سمجھے
باوفا ہیں جو اسی کو تو وفا کہتے ہیں

فکر اِس عالمِ فانی میں وہی زندہ ہے
جس کو سب کشتۂ تسلیم و رضا کہتے ہیں

فکر کیرانوی

ع :- نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں (غالب)

ایسی تجلیاں ہیں کہاں آفتاب میں
انوارِ خاص ہیں مرے جامِ شراب میں

یزداں نے مسکرا کے بڑی دیر میں لکھا
اِک حرفِ آرزو مرے دل کی کتاب میں

اب ذوقِ دید میں ہے شعورِ حیاتِ نو
جلوؤں کو احتیاط سے رکھو نقاب میں

مجبور تیرے حُسن سے غنچوں کی آرزو
خوشبو ترے بدن کی رچی ہے گلاب میں

ہے باغباں کی ترچھی نظر اتنی بات پر
شعلوں کا ذکر آ گیا شبنم کے باب میں

ساغرؔ کسی کی یاد میں جب اشکبار تھے
کتنے حسین دن تھے جہانِ خراب میں

ساغرؔ صدیقی

۷۔ پیتا ہوں روز ابرو شبِ ماہتاب میں (غالب)

عکسِ رُخِ حبیب ہے جامِ شراب میں
یا ماہتاب اُترا ہے موجِ چناب میں

ترمیم ہو رہی ہے محبّت کے باب میں
وہ جب سے آگئے ہیں مرے انتخاب میں
اب حادثاتِ دہر بھی حد سے گزر گئے
کیوں دیر ہو رہی ہے مگر انقلاب میں
لرزاں ہے حُسن حلقۂ رخسارِ یار پر
یا چاندنی چھلکتی ہے سیمیں رکاب میں
رودادِ گلستاں سے ملا ہے مجھے سراغ
خونِ شہیدِ عشق ہے رنگِ گلاب میں
اِک حرفِ مدّعا! بنا عنوانِ بے کسی
یہ پہلا مرحلہ تھا محبّت کے باب میں
انکارِ ذاتِ حُسن سے صابر اٹھا سوال
تخلیقِ کائنات ہے اِس کے جواب میں

صابر جالندھری

ع :- کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں (غالب)

(۳)

اِک ہم کہ موت مانگ رہے ہیں شباب میں
اِک تم کہ لطف و عیش پہ مائل ہو خواب میں
جب ایک قطرہ بھی نہ مِلا دشتِ شوق میں
پھر یونہی ہم بھٹکتے رہے ہیں سراب میں
جو اپنی دھڑکنوں سے میسّر ہوئی ہمیں
وہ لَے نہ مِل سکی ہمیں تارِ رباب میں
کس حوصلے سے ان کا اُٹھائیں نقاب ہم
بے تاب کر رہے ہیں وہ ہم کو حجاب میں
پہلے تو ان کا مِلنا حقیقت سے دُور تھا
اور اب ہر ایک شب نظر آتے ہیں خواب میں
اِک وہ کہ دردِ دل کی خبر تک نہ لے سکے
اِک ہم کہ ہر ستم لکھا اپنے حساب میں
اب ہم نے دردِ ہجر میں ہی پا لیا سکوں
امجدؔ یہ راز کھل گئے کِس اِضطراب میں

امجد اقبال

ع ۱- حیراں ہوں دِل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں (غالب)

طے کر چکا حدودِ مقامِ نظر کو میں
دیر و حرم بخیر اُٹھاتا ہوں سر کو میں

جلوہ کبھی، حجاب کبھی، جلوہ گہ کبھی
کیا کیا سمجھ رہا تھا فریبِ نظر کو میں

قسمت سے آج حسنِ تجلی ہے بے نقاب
اللہ کس سے مانگ کے لاؤں نظر کو میں

اصلِ وجود، عینِ بقا، حاصلِ حیات
کیا کیا نہ سمجھا زندگیٔ مختصر کو میں

خود نقشِ پا ہے اب مرا مسجودِ کائنات
وہ دِن بھی تھے کہ پوجتا تھا سنگِ در کو میں

پھر انجذابِ جلوہ کے ہیں دل کو حوصلے
پھر تولتا ہوں قوّت و ظرف و نظر کو میں

فریاد کا مذاق اُڑاتے ہیں اہلِ دہر
شاداںؔ کہاں سے ڈھونڈھ کے لاؤں اثر کو میں

اِلیاس شاداںؔ

ع:- اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں (غالب)

کیوں پھونک دوں سفر میں نہ رختِ سفر کو میں — منزل سمجھ رہا ہوں تری رہگذر کو میں

وہ جس میں دل کو نورِ تبسّم نصیب ہو — لاؤں کہاں سے ڈھونڈ کے ایسی سحر کو میں

صیّاد میرے ذوقِ اسیری کی داد دے — خود پھونک کر بہار میں آیا ہوں گھر کو میں

اے شہرِ آرزو تری تزئین کے لئے — کرتا ہوں صرف شوق سے خونِ جگر کو میں

یہ بن چکی ہے آپ کا آئینۂ جمال — جھٹلا سکوں محال ہے اپنی نظر کو میں

اُڑ جاؤں گا قفس کو پروں پر لئے ہوئے — ترتیب دے رہا ہوں ابھی بال و پر کو میں

دشتِ جنوں سے لاکھ محبّت سہی، مگر — مشکل ہے بھول جاؤں ترے بام و در کو میں

تاراجیٔ حیات مرا کیا قصور ہے — رہزن سمجھ رہا ہوں ابھی راہبر کو میں

صابرؔ کسی کی چشمِ عنایت کا شکریہ
فارغ ہر ایک غم سے ہوا عمر بھر کو میں

صابرؔ گیلانی

ع :- ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں (غالب)

اب چمن بھر میں کسی پر کوئی بیداد نہیں
اب کوئی دام نہیں اور کوئی صیاد نہیں

میں کسی سے نہیں کہتی کہ عنایت کی نظر
بس اسی بات سے میں لائقِ امداد نہیں

ہاں بہت رنج بہت شکوے تھے دل میں لیکن
کیا کہوں تم سے کہ اب کچھ بھی مجھے یاد نہیں

دیکھنے والے مجھے اشک بہاتے ہیں مگر
میرا دل ہے کہ ابھی مائلِ فریاد نہیں

شہر میں اور بھی کچھ چاک گریباں سے ملے
ہاں مگر میری طرح کوئی بھی ناشاد نہیں

مہربانی کی بھی اُمید نہیں تجھ سے مجھے
تجھ سے شکوہ بھی کوئی اور ستم ایجاد نہیں

میرا مسلک ہی محبت ہے عداوت سے گریز
نادرہ میرے لئے کوئی بھی اُفتاد نہیں

سعیدہ نادرہ نیازی

ع: ۔ نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں (غالب)

قتل کر قتل کہ میں قتل سے ناشاد نہیں،
دمِ عیسیٰ ہے، دمِ خنجرِ بیداد نہیں

ہر قدم پر ہے شبستانِ سیہ بختیٔ عشق
دشت میں بھی ہمیں تکلیفِ سفر یاد نہیں

اشکِ غم پر ہے اسے گریۂ شادی کا گماں!
ہائے فریاد بھی میری کوئی فریاد نہیں

ہے جفا ان کو پسند اور وہ ہیں دل کو پسند،
یعنی ناشاد نہیں ہوں میں اگر شاد نہیں

ہر رگِ گل ہے مجھے رشتۂ دامِ صیاد
میں وہ طائر ہوں کہ گلشن میں بھی آزاد نہیں

تیزیٔ بادِ صبا غنچے کو گل کرتی ہے
بڑھ گئی حد سے جو بیداد وہ بیداد نہیں

چھڑ گیا ذکر جو اُس بزم میں تیرا صابرؔ!
کس تغافل سے وہ بولے کہ "ہمیں یاد نہیں"

صابر جلیلی،

ع ۱۔ تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں (غالب)

○

وارفتگانِ کوچۂ دلدار کیا کریں
اے جانِ جاں! بتا ترے بیمار کیا کریں

ہم جانتے ہیں حضرتِ ناصح تمہیں مگر
رُسوا جناب کو سرِ بازار کیا کریں

قسمت میں غم لکھا تھا سو وہ ہم نے پا لیا
دل کی لگی کا آپ سے اظہار کیا کریں

یہ تو نہیں تھا آہ! مری خامشی کا راز
تم نے کہا ہے عشق تو اِنکار کیا کریں

کیں منّتیں، خوشامدیں، پاؤں بھی پڑ لئے
اب اور آپ سے بھلا اصرار کیا کریں

ہو اور کوئی غم تو مداوا بھی ہو سکے
تیرا ہو غم تو پھر مرے غم خوار کیا کریں

کوشش تو کی ہے ترکِ تمنا کی ہم نے برقؔ
بس چل سکے نہ جی پہ تو ناچار کیا کریں

برقؔ سیالکوٹی

ع:- کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں (غالب)

○

نہ زلفِ شام نہ روئے سحر کو دیکھتے ہیں
ہم اہلِ شوق تمہاری نظر کو دیکھتے ہیں

ہجومِ رحمتِ پروردگار کیا کہیئے
مقامِ عظمتِ دامانِ تر کو دیکھتے ہیں

ہیں نو اسیر گمان و یقیں کے پھندے میں
کبھی قفس کو کبھی بال و پر کو دیکھتے ہیں

اب اہلِ ہوش پہ ٹوٹے ہیں حیرتوں کے پہاڑ
مرے جنونِ وفا کے اثر کو دیکھتے ہیں

خفا نہ ہو کہ حقیقت میں ہیں وہ دیوانے
جو تیرے شہر کے دیوار و در کو دیکھتے ہیں

قدم قدم پہ نظر آ گئی ہیں منزل
وہ اور لوگ ہیں جو رہگزر کو دیکھتے ہیں

مری نگاہ زمانے سے دور ہے اخترؔ
زمانے والے نہ جانے کدھر کو دیکھتے ہیں

اخترؔ انصاری، اکبر آبادی

ع:- سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں (غالب)

عشق کی ناکامیاں اب تو نمایاں ہوگئیں
جو دعائیں میں نے کیں تیری نگہباں ہوگئیں

جان جائے گی مری اُس نو بہارِ حُسن پر
جس پہ ساری صنعتیں خالق کی قرباں ہوگئیں

تیرے نظارے کو دو آنکھیں ملیں روزِ ازل
وائے حسرت وہ بھی نذرِ کنجِ زنداں ہوگئیں

چند تصویریں مری تفریح کا ساماں تھیں
آجکل وہ بھی سپردِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

میری ہر رگ میں ہزاروں آرزوئیں تھیں نہاں
رفتہ رفتہ سب کی سب مل کر رگِ جاں ہوگئیں

چند موجیں نُور کی جو چشمۂ ہستی میں تھیں
عشق کی جنبش سے ابھریں اور انساں ہوگئیں

عشق کے سینے میں جو کیفیتیں مستور تھیں
حُسن کی محفل میں آتے ہی نمایاں ہوگئیں

آہ کیا عالم تھا اپنا رات اس کے روبرو
بجلیاں جس کی نگاہوں سے گریزاں ہوگئیں

لے گیا آخر وہاں جوشِ جنوں مجھ کو نظیرؔ
حسن کی آنکھیں بھی جس محفل میں حیراں ہوگئیں

نظیرؔ لدھیانوی

ع ۱۔ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں (غالب)

آرزوئیں دل کی بربادی کا ساماں ہو گئیں
مختصر سی چند موجیں بڑھ کے طوفاں ہو گئیں

میری بیتابی سے پیچ و تاب میں ہے کائنات
میرے دل کی دھڑکنیں ذرّوں میں رقصاں ہو گئیں

برہمی سے کاروبارِ حسن کی رونق بڑھی
جم گیا رنگ اور جب زلفیں پریشاں ہو گئیں

ان کی رسوائی کے ڈر سے مجھ پہ سو قیدیں لگیں
عشق کی مجبوریاں دیوارِ زنداں ہو گئیں

یہ ہجومِ بیکسی، یہ طولِ شب ہائے فراق
مجھ سے خود میری تمنائیں گریزاں ہو گئیں

اے بہارِ رفتہ! میں کس کس کا اب ماتم کروں
کتنی کلیاں تھیں کہ مرجھا کر پریشاں ہو گئیں

میں نے دل کی موت پر غربت میں جب ماتم کیا
دشت کی ساری ہوائیں مرثیہ خواں ہو گئیں

ہر نفس اِک آہ تھی، ہر آہ میری شُعلہ بار
میں گیا جس بزم میں شمعیں فروزاں ہو گئیں

دل کو راس آتی گئیں یوں پے بہ پے ناکامیاں
تلخیاں آخر مرے ہر دُکھ کا درماں ہو گئیں

میرے در تک عیشِ دُنیا کا گزر ممکن نہیں
دہر کی ساری بلائیں میری درباں ہو گئیں

دیکھ عبرت سے تبسّم! موسمِ گل کا مآل
اُڑ گیا ہر رنگ خوشبوئیں پریشاں ہو گئیں

عبدالرشید تبسّم

ع :- خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں (غالبؔ)

جو کبھی ساحل سے ٹکرا کر گریزاں ہو گئیں
جوش میں آئیں وہی موجیں تو طوفاں ہو گئیں

دیکھ کر اک مہ جبیں کے عارضِ گلرنگ کو
میری نظریں صورتِ آئینہ حیراں ہو گئیں

اپنے ماتھے کی شکن سے پوچھ کر یہ دیکھ لے
کیوں لکیریں ہاتھ کی اب دشمنِ جاں ہو گئیں

جن نگاہوں کو سمجھ رکھا تھا میں نے سرسری
وہ بتدریج اپنے افسانے کا عنواں ہو گئیں

پھول بھی میری نظر میں خار آخر بن گئے
باغ کی وہ رونقیں جزوِ بیاباں ہو گئیں

اب نہیں ہے دل میں اُن کا ایک مبہم عکس بھی
آرزوئیں اب وہ نذرِ یاس و حرماں ہو گئیں

دھڑکنوں کے ساز پر چھیڑی ہے میں نے یہ غزل
دھڑکنیں نغمہ زنِ تارِ رگِ جاں ہو گئیں

مل گیا مجھ کو حدیدؔ اپنی محبت کا صلہ
وہ نگاہیں عرضِ غم پر جب پشیماں ہو گئیں

حدیدؔ مرزا

ع۱۔ دیوانگی سے دوش پر زنار بھی نہیں (غالب)

یہ تو نہیں کہ لائقِ اظہار بھی نہیں
ہم کو بیانِ درد پہ اصرار بھی نہیں
کٹتا ہی جا رہا ہے ہر اک رشتۂ اُمید
ہاتھوں میں وقت کے کوئی تلوار بھی نہیں
یہ اور بات حشر کا دیتے ہیں آسرا
اُن کو وفائے عہد سے انکار بھی نہیں
سائے شجر کے چاٹ گئی دھوپ کی زباں
ٹھہریں کہاں کہ سایۂ دیوار بھی نہیں
میں کس طرح سناؤں انھیں داستانِ شوق
کیسے کہوں کہ طاقتِ گفتار بھی نہیں
کچھ تو کہیں کسی سے کہ ہلکا ہو دل کا بوجھ
"صحرا میں اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں"
ہر سانس کاٹتی ہے رگِ جاں کو اے عدیم!
چلتی ہوئی ہوا کوئی تلوار بھی نہیں

عدیو هاشمی

۱۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں (غالب)

اپنی نگاہِ مست سے پہلے کوئی پلائے کیوں
بادہ کشانِ عشق کو بزم سے پھر اُٹھائے کیوں

جب کوئی غم نصیب ہو بزمِ طرب میں جائے کیوں
دیکھ کر اہتمامِ عیش، دردِ جگر بڑھائے کیوں

عشق کی ابتدا بری، عشق کی انتہا خراب
جاں پہ کھیل کر کوئی مفت میں جاں گنوائے کیوں

دل ہے جو تیری جلوہ گاہ، اس کا مجھے جواب دے
اپنے ہی آشیانے پر برق کوئی گرائے کیوں

رسمِ وفا سے محترز، درد سے غیر آشنا
اس کا طریقِ عاشقی میری سمجھ میں آئے کیوں

اور بھی کوئی بارِ غم ڈال دے میرے دوش پر
صبر ہی جس کا فخر ہو، درد سے جی چرائے کیوں

دوست عروسِ بخت کی یہ ہیں کرشمہ سازیاں
روتے ہو بار بار کیوں کرتے ہو ہائے ہائے کیوں

دوست جالندھری

غ:- کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو (غالب)

مرا دردِ جگر وابستۂ دردِ جہاں کیوں ہو
جو میری داستاں ہے دوسرے کی داستاں کیوں ہو

تمہیں سے جب نہیں شکوہ تو درباں کی شکایت کیا
تمہیں نامہرباں ٹھہرے تو پھر وہ مہرباں کیوں ہو

کسی کی یاد دل کو کیوں ستائے ترکِ اُلفت پر
کوئی درپردہ یوں منت کشِ ضبطِ فغاں کیوں ہو

ازل سے ہو جو خود پروردۂ برقِ بلا اس کو
غمِ بربادیٔ گلشن، ملالِ آشیاں کیوں ہو

تجلّی مانعِ نظارۂ حُسنِ حقیقت ہے
یہ پردہ بھی اُٹھا دیجئے کہ یہ بھی درمیاں کیوں ہو

یہ کیفیت! چراغِ صبح جیسے دے اُٹھا ہو لَو
غضب تھا اُن کا اتنا پوچھ لینا سرگراں کیوں ہو

بقدرِ یک قدم ہے وسعتِ کونین اے واعظ
نظر میری بقیدِ مہر و ماہ و کہکشاں کیوں ہو

زمین و آسماں گردِ رہِ منزل ہیں اے ناداں
جو گردِ رہ میں گم ہو جائے میرا کارواں کیوں ہو

نہ ہو بیدلؔ جسے کچھ پاسِ آئینِ وفاداری
وہ میرا ہم خیال و ہم زبان و راز داں کیوں ہو!

بیدلؔ فاروقی
مرادآبادی

ع:- وہ جو ہم رکھتے تھے اِک حسرتِ تعمیر، سو ہے (غالب)

اپنے پاؤں میں وفاؤں کی تھی زنجیر، سو ہے
وجہِ تسکین تھی تری زلف گرہ گیر، سو ہے

ہم نہ بدلیں گے بدلتے ہوئے موسم کی طرح
اپنی نظروں میں تری جو بھی تھی توقیر، سو ہے

خاک اُڑتی ہے حقیقت کے بیابانوں میں
خوابِ گلشن رہا شرمندۂ تعبیر، سو ہے

شہر میں کتنے سیہ خانے، سیہ خانے رہے
اونچے محلوں پہ جو تھی بارشِ تنویر، سو ہے

زیرِ دام آتے ہیں دانے ہی کے لالچ میں طیور
رزقِ صیّاد تری کل بھی تھا جاگیر، سو ہے

شکلِ سقراط کبھی صورتِ منصور کبھی
عشق ہر دور میں تھا لائقِ تعزیر، سو ہے

صاحبِ جاہ تھے جو حرفِ غلط ہو کے رہے
زندہ ہر دور میں تھی سنّتِ شبیر، سو ہے

یہ الگ بات کہ کانٹوں سے نہ مہکار اُٹھی
تھی جو خوشبو میں بکھر جانے کی تاثیر، سو ہے

وقت کی گرد بھی دھندلا نہ سکی اس کو سلیم
دل کے آئینے میں تھی یار کی تصویر، سو ہے

سلیم کاشر

ع :- جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے ! (غالب)

○

جس کو میں سمجھا تھا میرا مونس و غمخوار ہے
آج اس کو بھی رفاقت سے مری انکار ہے

کس کو تم جا کر سناؤ گے ستم کی داستان
وہ کوئی انساں نہیں پتھر کی اک دیوار ہے

حسرتوں کی دھوپ میں احساس تک جھلسا گیا
اور انساں سے گریزاں سایۂ دیوار ہے

اب کہاں وہ زندگی، وہ گرمیٔ محفل کہاں
اپنی ہستی سے بھی اب تو آدمی بیزار ہے

یوسفِ احساس اب بکتا نہیں ہے دوستو
گرم پہلے سے بھی گو اب مصر کا بازار ہے

کون کہتا ہے کہ مفلس ہوں تہی دامن ہوں میں
بخت ہیں خفتہ اگر، احساس تو بیدار ہے !

دیکھ لے غالب ہے کتنا ضبط کا یارا ہمیں
"ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے"

جانے کیوں ڈسنے لگی ہے آج گلشن کی فضا !
سانس لینا بھی ہمیں خالد یہاں دشوار ہے

خالد شفیق

ع ۱۔ یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے (غالب)

باعثِ تسکینِ دل ان کی نگاہِ ناز ہے
سخت حیرت ہے، کہ یہ بجلی نشیمن ساز ہے

سازِ دل کو لوگ کہتے ہیں انوکھا ساز ہے
وہ یہ کہتے ہیں کہ پہچانی ہوئی آواز ہے

ہوں تو مشتِ خاک لیکن میں وہ مشتِ خاک ہوں
فرش سے تا عرش جس کی جرأتِ پرواز ہے

ایک دیوانے پہ تھے موقوف ہنگامے تمام
کس قدر سونی اب ان کی جلوہ گاہِ ناز ہے

مست ہو کر اپنی نکہت سے، نہ تو اے پھول جھوم
بوئے آوارہ شکستِ رنگ کا آغاز ہے

آشیاں سے جب اڑے پہنچے قفس کی سمت ہم
یہ زمانے سے نرالی شوخیِ پرواز ہے

ہوتی آئی ہیں ازل سے اس کی تفسیریں بہت
عشق لیکن دو دلوں کے درمیاں اک راز ہے

تازگی، افسردگی، بوئے محبت، زندگی
جو گلوں کا ہے مرے دل کا وہی انداز ہے

جنبشِ لب ہے کہ ہے غنچہ چٹکنے کی صدا
آتشِ گل ہے کہ صابرؔ شعلۂ آواز ہے

صابرؔ گیلانی

ع: ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے (غالب)

لائی ہے کس مقام پہ میری خطا مجھے
اہلِ ستم سمجھتے ہیں جانِ سزا مجھے

چلتا جو میرے ساتھ اُٹھاتے ہوئے صلیب
کوئی بھی شہر بھر میں نہ ایسا مِلا مجھے

دیوانے مصلحت کے سرابوں میں کھو گئے
پائل کا گیت شورِ سلاسل لگا مجھے

زنداں کی وادیوں میں یہ کیسا سکوت ہے
ملتا نہیں سراغ بھی آواز کا مجھے

دیوار و در اُداس ہیں افسردہ راستے
ویرانیوں کی آنچ نے جھلسا دیا مجھے

چُبھنے لگی ہے آنکھوں میں کانٹوں سی روشنی
یہ ہیں چراغ جن سے نوازا گیا مجھے

انسان کے لباس میں گزرا ہے بخت کون
ڈسنے لگے ہیں راستوں کے نقشِ پا مجھے

حسن بخت

ع ٤٠- شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے (غالب)

ے جا رہی ہے شاخ سے کر کے جدا مجھے
جانے کہاں اُتارے گی برہم ہوا مجھے

یہ شہر چھوڑنا ہے مرا دہر چھوڑنا
یہ شہر چھٹ گیا تو نہ پھر ڈھونڈنا مجھے

یادوں کے جگنوؤں کا چمکنا بھی بہتر تھا
آندھی بجھانے آئی سمجھ کر دِیا مجھے

اُلجھن سی تیرے دل میں بھی ہے کچھ نہ کچھ ضرور
سُنتا نہیں مری تو پھر اپنی سُنا مجھے

تو بھی نہ پستیوں میں مرے ساتھ آ گرے
دِل کی بلندیوں سے سنبھل کر گرا مجھے

اب میں ہوں اور بھاگتے لمحوں کی گونج ہے
رُوحی کہاں گیا کوئی دے کر صدا مجھے

رُوحی کنجاہی

ع:- آنے لگی ہے نکہتِ گُل سے حیا مجھے (غالب)۔

دُنیا سمجھ رہی ہے وفا آشنا مجھے
یہ تم نے کیا مقام عطا کر دیا مجھے

کلیوں میں رنگ رُوپ پھولوں میں تازگی
کیا خاک راس آئے چمن کی فضا مجھے

میں نے قدم قدم پہ دیا ہے اُسی کا ساتھ
جس نے قدم قدم پہ ہی دھوکا دیا مجھے

اب سر پہ ہے سوار مرے فکرِ روزگار
اب کچھ بھی سوجھتا نہیں اچھا بُرا مجھے

سُنتا نہیں کوئی بھی غریب الوطن کی بات
بدنام کر رہی ہے مری التجا مجھے

ہوتی ہے خلوتوں میں اُمیدوں سے گفتگو
میرا جنوں کہاں سے کہاں لے گیا مجھے

دُنیا میں جس کے واسطے راھی تباہ ہوں میں
وہ اجنبی ہی بن کے مِلا جب مِلا مجھے

اقبال احمد راھیؔ

ع: بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے (غالب)

مر مر کے امتحانِ وفا میں جیا کیے
اہلِ جنوں جو کر نہ سکے ہم کیا کیے

افسوس تم بھی دیکھنے آئے نہ وقتِ نزع
بیٹھے تھے ہم تمہیں پہ فقط آسرا کیے

اظہارِ عشق، سوزِ دروں، پاسِ عاشقی
اِک خامشی میں سینکڑوں مطلب ادا کیے

رودادِ عشق اور حسیں ہو کے رہ گئی
اچھا ہوا نہ آپ نے وعدے وفا کیے

میں اضطراب میں ہوں مگر دل ہے مطمئن
اس نے جفا کے روپ میں وعدے وفا کیے

کچھ ہے تو ہے ہیں سے ترے آستاں کی لاج
سر دے دیا مگر ترے سجدے ادا کیے

بے وجہ تو نے روک دی اپنی زباں وحید
تیری خموشیوں سے فسانے بنا کیے

وحید الحسن ہاشمی

ع:- بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے (غالب)

دِل کو نثارِ جلوۂ رنگیں ادا کئے
بیٹھا ہوا ازل سے ہوں عہدِ وفا کئے

ملتی نہیں وہ آبلہ پائی کی لذّتیں
کس نے یہ میرے پاؤں سے کانٹے جُدا کئے

مُشتاقِ دید دشت و جبل ایک کر گیا
گلزارِ لن ترانی میں ہم گل چُنا کئے

وہ لاکھ جبّہ سائی پہ بھی مطمئن نہیں
ہم ان کی اِک خموشی پہ ہیں اکتفا کئے

مستِ لقا کو ہوش ہی کب تھا نماز میں
ارمانِ دید سجدے پہ سجدے کیا کئے

برباد بھی یہ خاکِ نشیمن نہ ہو سکی
ذرّے فضا میں اُڑ کے فسانے بنا کئے

کیسے کہوں اُمید بھی بر آئے گی سہیل
مدّت گزر چکی ہے مجھے التجا کئے

سُہیل بنارسی

غ "ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے" (غالب)

کوئی جلوہ نہ یہاں کوئی تماشائی ہے
غیرتِ عشق مجھے تو یہ کہاں لائی ہے

زندگی کا تو ہر اِک شخص تمنائی ہے
زندگی اُس کی ہے جو موت کا شیدائی ہے

آہ کرنا تو بڑی بات ہے رُسوائی ہے،
بات یہ پہلے بھی اے دل تجھے سمجھائی ہے

تم مرے غم کا مداوا نہ کرو تو بہتر،
میرا دل خود بھی تڑپنے کا تمنائی ہے

آپ کیوں اپنی جفاؤں پہ پشیمان ہوئے
ہم نے تو آہ نہ کرنے کی قسم کھائی ہے

اِس تراپے میں ہے یہ جذبۂ اخلاص کی شان
ہم نے جو بات کہی خلق نے دُہرائی ہے

اپنا ہی عکس ہے جو دیکھ رہی ہیں آنکھیں،
بے وفا ہے نہ مِری جاں کوئی ہرجائی ہے

حنیف صابری

ع: ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے (غالب)

○

اب نہ جینے کی نہ مرنے کی تمنّا دل میں ہے
زندگی تجھ سے بچھڑ کر کس قدر مشکل میں ہے

گلشنِ ہستی میں ہم نے دُور تک ڈھونڈا مگر
کچھ سکونِ دل اگر ہے تو تری محفل میں ہے

ہوگیا ہر راز خود ہی تیرے چہرے سے عیاں
ہر زباں پر آ گئی جو بات تیرے دل میں ہے

اِک جوانی کے سوا سب منزلیں بے کار ہیں
زندگی کا لطف جو کچھ ہے اِسی منزل میں ہے

زندگی اک با مشقّت قید ہے اے دوستو
پھر بھی جینے کی تمنّا ہر کسی کے دل میں ہے

ان کے آنے سے ہوئی ہے بزم روشن اس طرح
جیسے دلکش روشنی نمادِ مہ کامل میں ہے

عبدالوہابؔ عادِلؔ

ع ۱ ۔ کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی ۔ (غالب)

دامانِ آرزوئے نظر خوں سے بھر گئی
دل کی دُعائے نیم شبی خون کر گئی

رنگینیٔ فریبِ تحشیں بتاؤں کیا
صد جلوہ ہائے حُسن پہ میری نظر گئی

اخفائے رازِ عشق کی نیرنگیاں نہ پوچھ
جانے کہاں کہاں سے کہاں تک خبر گئی

یوں میری دستِ وقت نے کی پا شکستگی
آوارگیٔ عرصۂ شام و سحر گئی

اُس چاندرات پچھلے پہر آگ ہی تو تھی
"سوہنی" کی ایک تان کہ دل میں اُتر گئی

ٹکرا گئی تیری نظرِ دل نواز سے
میری نظر جو رات کو سوئے قمر گئی

پتّیاں بزیرِ شاخ پریشان دیکھ کر
تتلی شگفتنِ گلِ تازہ سے ڈر گئی

خواجہ کہاں گئیں وہ مسافر نوازیاں
اب خواہشِ سیاحت و سیر و سفر گئی

نذیر احمد خواجہ

ع: - اُٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی (غالب)

وارفتگیٔ شوق جو حد سے گزر گئی
بے خود بنا گئی، کبھی دیوانہ کر گئی

چونکا دیا تھا جس نے بھری بزم میں مجھے
وہ بات آپ کی مرے دل میں اُتر گئی

فصلِ بہار آتے ہی ہر سمت دیکھئے
خوشبو گلوں کی صحنِ چمن میں بکھر گئی

ان کی نگاہِ لطف و کرم کا یہ فیض ہے
بگڑی ہوئی ہماری جو قسمت سنور گئی

ہوگا شعورِ زیست نہ حاصل انہیں کبھی
جن کے دلوں سے عظمتِ اہلِ نظر گئی

کوشش تو چارہ گر نے بہت کر کے دیکھ لی
پھر بھی نہ میری سوزشِ زخمِ جگر گئی

بھٹکے ہیں اپنی راہ سے کچھ ایسے ہم رشیدؔ
یہ بھی خبر نہیں ہے کہ منزل کدھر گئی

رشید اکبرآبادی

ع :- اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی (غالب)

◯

تاثیرِ عشق قلب کو بے چین کر گئی
اٹھا جگر میں درد تو دل تک خبر گئی

اُن سے ملی جو آنکھ تو بیگانہ کر گئی
اِک برق سی نظر سے جگر میں اُتر گئی

ظالم کی اس نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ
جو میرے ٹوٹے دل کو رضامند کر گئی

اب کیا بتاؤں عشق و محبت کی گردشیں
جس آنکھ میں تھے اشک لہو سے وہ بھر گئی

تم نے نظر کو پھیر لیا ڈال کر نگاہ !
پوچھو تو مجھ سے دل پہ مرے کیا گزر گئی

اے ہنسنے والے حسن و محبت کا واسطہ
پھر مسکرا کہ لذتِ زخمِ جگر گئی

کہتے نہ تھے کسی سے محبت نہ کیجیے
ثامنؔ بتایئے وہ جوانی کدھر گئی

ثامن نقوی

ع:- میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے (غالب)

یکجا حزیں و انور و نصرتؔ، قمرؔ ملے
اللہ! اب نہ اور کسی کی خبر ملے

ہر جنبشِ قدم میں ہے اقرارِ نارسی
اور اس پہ شوق یہ کہ تری رہگذر ملے

کردوں اسے بھی نذرِ تمنائے کوئے یار
مجھ کو جو عیشِ خلد بھی بارِ دگر ملے

کیوں منفعل ہے سعیٔ مداوائے زخمِ دل
میں ہاتھ چوم لوں جو مجھے چارہ گر ملے

نادم ہوں جاں نوازیٔ پیکانِ یار سے
مجھ کو تو زخم بھی نہ بقدرِ جگر ملے

وہ کشتگانِ خنجرِ بیداد کیا کریں
تعزیر جن کو جرم سے بھی بیشتر ملے

تم کو تو ان سے ترکِ تعلق کے بعد فیضؔ
ملنا نہ چاہیئے تھا اصولاً مگر ملے

فیضؔ کاظمی

ابنِ حزیں سیالکوٹی - علامہ لطیف انور - نصرت قریشی - استاد قمر جلالوی - یہ چاروں مرحومین جو گزشتہ سال ہم سے جدا ہوگئے

ع ہیں کر بتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے (غالب)

○

نظارہ دل نواز کہاں، گر نظر ملے
گلشن میں بھی ندیم، ہمیں نوحہ گر ملے

کچھ کم نہ تھا فراق میں رونا پھر آج کیوں
ملنے گئے جو یار سے با چشمِ تر ملے

ہر گام پر نکلتے ہیں سو راستے یہاں
گم کردہ راہ ہم سے سوا، راہبر ملے

اے شیشہ گر بتا ہمیں بھی اگر کہیں
ٹوٹے ہوئے دلوں کا کوئی چارہ گر ملے

کون و مکاں میں ڈھونڈھ کے جب تاؔج تھک چکا
دل کے حریمِ شوق میں وہ جلوہ گر ملے

ظہیر احمد تاج

ع : کوئی اُمّید بر نہیں آتی (غالب)

○

سازِ دل کی خبر نہیں آتی
اِک صدا ہے مگر نہیں آتی

رنگ و بو پر ہنسی تو آتی ہے
اپنے حالات پر نہیں آتی

دل کا سورج تو جل کے راکھ ہوا
اب صدائے سحر نہیں آتی

روشنی زندگی کی راہوں میں
منزلوں تک نظر نہیں آتی

دل کے ساحل پہ ہے وہ سنّاٹا
اب کوئی موج اِدھر نہیں آتی

دل کی صورت نظر تو آتی ہے
دل کی حالت نظر نہیں آتی

شعر طاہرؔ زمینِ غالبؔ میں
بات آساں نظر نہیں آتی

طاہرؔ لاہوری

ع:۔ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے (غالب)

بے رُخی کیا ہے اعتنا کیا ہے
میرے اس درد کی دوا کیا ہے

جب اُمنگیں ہی ہٹ گئیں دِل کی
میرے مرنے میں پھر رہا کیا ہے

چھوڑیے یہ فضول تمہیدیں
صاف کہیے کہ مدّعا کیا ہے

لے کے نامِ خدا اُٹھا لنگر
جوشِ طوفاں کو دیکھتا کیا ہے

ہو رہی ہیں نوازشیں پیہم
میری قسمت کا پوچھنا کیا ہے

دردِ پیہم ہے ابتدا جس کی
اس محبت کی انتہا کیا ہے

داغِ دل کے مقابلے میں شہیدؔ
ماہ و خورشید کی ضیا کیا ہے

قُربان حسین شہیدؔ

ع:۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے (غالب)

○

میرے اشکوں کا مدعا کیا ہے
آپ کی جانے یہ بلا کیا ہے

کھیل ہے سب تری نگاہوں کا
زندگی کیا ہے اور قضا کیا ہے

میری ہستی کی کائنات نہ پوچھ
اِک تری یاد کے سِوا کیا ہے

خود سفینہ بھنور میں پہنچا تھا،
تجھ سے شکوہ ہی ناخدا کیا ہے

لے کے اِس دل کو کیا کریں گے آپ
اُجڑی بستی میں اب دھرا کیا ہے

زہرِ غم یا شراب ہے ساقی
اور انساں کا آسرا کیا ہے

غم سے خالی اگر ہو دِل انورؔ
ایسے جینے میں پھر مزا کیا ہے

رشید انورؔ

ع: کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے (غالب)

صبر کیا چیز ہے ، رضا کیا ہے
زِندگی ، جبر کے سوا کیا ہے

حُسن کا نازِ دِلربائی بھی
ناروا ہے تو پھر روا کیا ہے

آج دِل کی فضا ہے کیوں خاموش
ذہن میں ایک شور سا کیا ہے

وقت عمرِ رواں کا نام سہی
ابتدا کیا ہے انتہا کیا ہے

ضبط جور و ستم نہ ترک طلب
پھر علاجِ غمِ وفا کیا ہے

حُسن تصویر ، عشق آئینہ
پھر یہ ہم تم میں فاصلہ کیا ہے

کل تھے مختار ، آج ہیں مجبور
سبب اس انقلاب کا کیا ہے

مُختار بخاری

ح غ ۷۔ اگر مری جان کو قرار نہیں ہے (غالب)

مجھ کو ابھی غم کا اعتبار نہیں ہے
دردِ جگر دردِ روزگار نہیں ہے

غم کی کڑی دھوپ خوشگوار نہیں ہے
زلفِ معنبر بھی سایہ دار نہیں ہے

دوست تری یاد کے نقوش کہاں اب
دل میں کوئی زخم یادگار نہیں ہے

شوئی قسمت نے تباہ کر گئی مجھ کو
پھر بھی مری آنکھ اشکبار نہیں ہے

دل ابھی واقف نہیں ہے شورِ جنوں سے
دل ابھی زخموں سے لالہ کار نہیں ہے

کیسے شگفتہ ہو میری داستانِ غم
یہ کوئی افسانۂ بہار نہیں ہے

ترکِ رہ و رسم ان سے ہو تو کہاں سے
مجھ کو ابھی دل پہ اختیار نہیں ہے

کیسے میں توڑوں غرورِ قیصر و کسریٰ
عزمِ جنوں عزم پائیدار نہیں ہے

انیس اعجازی، چٹاگانگ

ح ۹۔ اِک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے (غالب)

جب کوئی شعلہ نوا نغمہ سرا ہوتا ہے
ہر نفس دل کے دھڑکنے کی صدا ہوتا ہے

ان کے دَر سے مجھے جو کچھ بھی عطا ہوتا ہے
وہ مری وسعتِ دامن سے سوا ہوتا ہے

ان کے کوچے سے جو نکلے تو کہاں جائے کوئی
سامنے سایۂ دیوار نما ہوتا ہے

مجھ سے بیزار نہ ہو مجھ سے تغافل نہ برت
یوں تو احساسِ کرم اور سوا ہوتا ہے

میرے حصّے کے ترے شہر میں پتھر بھی نہیں
اس کا صدمہ ترے غم سے بھی سوا ہوتا ہے

اشک بہتے ہوئے تھم جائیں تو کچھ عرض کروں
نطق ہر حال میں محتاجِ صدا ہوتا ہے

جب تک انساں کو نہ ہو عظمتِ انساں کا شعور
اعتقادِ حرم و دیر سے کیا ہوتا ہے

جس کی غیرت نہ مری ہو وہ اسیرِ خود دار
سارے زنداں کو رہا کر کے رہا ہوتا ہے

اُس کی فہرست میں امین ہے نہ گلزارِ خلیل
وہ جہاں چاہے وہاں جلوہ نما ہوتا ہے

اپنے احساسِ سماعت کا فسوں ہے ورنہ
ساز کیا چیز ہے آواز سے کیا ہوتا ہے

پرسشِ گردشِ دوراں پہ یہ ساقی نے کہا
یہ بھی اِک دائرۂ لغزشِ پا ہوتا ہے

مرگِ احساسِ یقیں کا تو نہیں کوئی علاج
ورنہ ہر روز یہاں روزِ جزا ہوتا ہے

اُس نے یہ کہہ کے مرے ہونٹ سیئے ہیں دانشؔ
یہ بھی معروضِ تمنا کا صلہ ہوتا ہے

احسان دانش

۷۰ ۔ آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے (غالب)

دِل کے حالات سُناؤں تو خفا ہوتا ہے
وہ سمجھتا ہے کہ میرا ہی گِلا ہوتا ہے

غنچہ نے گُل سے کہا، گُل نے عنادل سے کہا
آج پھر کوئی یہاں نغمہ سرا ہوتا ہے

پڑھ کے وہ خط نہ کہیں آنکھ سے جلنے چھوٹیں
لکھ تو بیٹھے ہیں انہیں، دیکھئے کیا ہوتا ہے

زخم بھی دل کا نِرالا ہے، معالج بھی عجیب
شام کو خشک تو ہر صبح ہَرا ہوتا ہے

چشمِ گریاں سے غریبوں کو ستانے والو!
اشک جو پھوٹ بہے موجِ بَلا ہوتا ہے

لکھنے آتے ہیں فرشتے بھی فلک سے ہمدم
جو قصیدہ تری آمد میں ادا ہوتا ہے

کس نے دیکھا ہے مجھے ترچھی نظر سے انورؔ
"آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے"

کبیر انور جعفری

ع، ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے ' (غالب)

روش روش جو پریشاں ہو جستجو کیا ہے
نصیب ہیں گل و لالہ تو آرزو کیا ہے

کوئی بتائے کہ میں کیا جواب دوں اُن کو
وہ پوچھتے ہیں ترے دل کی آرزو کیا ہے

گلوں پہ قطرۂ شبنم کو دیکھنے والو
مژہ پہ آکے ستاروں کی آبرو کیا ہے

تری نگاہ ترا حُسن، تیری رعنائی
یہ رنگ و بُو تو ہیں لیکن، یہ رنگ و بُو کیا ہے

تمہاری زلف بکھرتی ہے جس کے شانے پر
وہ جانتا ہے کہ فردوسِ مشک و بُو کیا ہے

یہ مسکراتی ہوئی چشم کی فسوں کاری
بغیرِ نطق یہ اعجازِ گفتگو کیا ہے

تمہاری راہ میں گم ہو کے یہ ہوا معلوم
تمہاری راہ میں منزل کی جستجو کیا ہے

یہ عمر اور پھر اس میں شفیقؔ عشق بتاں
خزاں رسیدہ چمن کی اب آرزو کیا ہے

شفیق کوٹی

ع ۱۔ تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے (غالب)

نہ اپنا ہوش نہ جس کو خبر، تو کیا ہے
وہ کیا بتائے تجھے اس کی آرزو کیا ہے

وہی جمال وہی رنگ و بُو وہی خوشبو
جو تو نہیں تو نگاہوں کے رُوبرو کیا ہے

تمہاری پلکوں نے قطروں کو کر دیا گوہر
وگرنہ اشک ہے کیا اس کی آبرو کیا ہے

رگوں میں دوڑنا پھرنا بھی کام ہے لیکن
کسی کے کام نہ آئے تو پھر لہو کیا ہے

سلام کر کے گزرتی ہے کہکشاں جس کو
طوافِ شمس و قمر اس کے روبرو کیا ہے

کسی کی ریشمی زلفوں کا فیض ہے ورنہ
بہار کیا ہے چمن کیا ہے رنگ و بو کیا ہے

مرا کلام رسیلا سہی مگر انجمؔ
کلامِ غالبؔ و مومنؔ کے روبرو کیا ہے

انجم یوسفی

ع:۔ سانپ کا کاٹا ہوا کس طرح پانی مانگے (غالب)

○

اُجرتِ نقشِ صنم مجھ سے زبانی مانگے
جان اِنعام میں دے دوں گا جو مانی مانگے

اُس کی تعریف میں لکھے ہیں ہزاروں اشعار
پھر بھی میرا یہ قلم اور روانی مانگے

عمرِ جاوید سے کیا فائدہ بہتر یہ ہے
دوسری بار اگر خضر جوانی مانگے

آئینہ دیکھ کے حیراں وہ ہوا کرتا ہے
اس کا مطلب ہے کہ اپنا کوئی ثانی مانگے

جس نے کچھ مانگا اُسے قتل کیا ہے اس نے
بے نشاں ہو کے کوئی اُس کی نشانی مانگے

زُلف کو چھو کے ہوا جان سے آزردہ ہیں
کس طرح سانپ کا کاٹا ہوا پانی مانگے

ہو گیا تیری محبت میں حمیدؔ آج شہید
لب چشیدہ ہے ترا لعلِ یمانی، مانگے

حمیدؔ لودھی

ع ۱۔ اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے (غالب)

یوں بام پر وہ آئے ہیں گیسو سنوار کے
یاد آ گئے ہیں دن مجھے ابرِ بہار کے

ہیں عندلیب مست کچھ ہونٹوں پہ تذکرے
گلشن میں ان کی لغزشِ مستانہ وار کے

بخشی ہیں جس کی زلف نے گلشن کو نکہتیں
ہم نے اٹھائے ناز اسی گلعذار کے

ہر پھول سوگوار ہے کلیاں اُداس ہیں
یہ کون ساتھ لے گیا چرچے بہار کے

دنیا میں آج شبلی و منصور ہیں کہاں
قصّے رسن کے رہ گئے افسانے دار کے

آہٹ پہ کان، در پہ نظر، دل پہ دھڑکنیں
لٹتے ہیں قافلے کسی اُمیدوار کے

خالی ہیں ہاتھ چہرے پہ چھائی ہے مُردنی
بازی کوئی حیات کی جاتا ہے ہار کے

تشنہؔ سحر ہوئی شبِ فرقت کی اس طرح
روشن ہوئے چراغ دلِ داغدار کے

رفیقِ تشنہ

ع: ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے (غالب)

کچھ نہ پوچھو اثرِ دیدۂ حیراں مجھ سے
آئینہ خانہ ہے صحنِ چمنستاں مجھ سے

وحشتِ جامہ دری ہے یہ نمایاں مجھ سے
ہے تزلزل میں ہر اک تارِ گریباں مجھ سے

سوزِ اُلفت سے ہے ہر قطرۂ خوں شعلہ فشاں
جادۂ خنجرِ قاتل ہے چراغاں مجھ سے

صبرِ عاشق ہے تری غیر نوازی کا سبب
رونق افروز ہوئی بزمِ حریفاں مجھ سے

اس سیہ خانے میں وہ سوختہ ساماں ہوں میں
ذرہ ذرہ ہے یہاں شمعِ شبستاں مجھ سے

آبلے ہیں خلشِ خار سے خوں نابہ فشاں!
اے ولیؔ رشکِ گلستاں ہے بیاباں مجھ سے

ولیؔ وارثی

ع :- کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے (غالب)

○

یاد کرتے نہ بنے اس کو بھلائے نہ بنے
نقش وہ دل پہ بنا ہے کہ مٹائے نہ بنے

اس کا گھر دور نہیں ہے مگر اب کیا کیجے
آپ جائے نہ بنے اس کو بلائے نہ بنے

کس سے اب کشمکشِ عشق کا رونا روئیں
دل کو تھامے نہ بنے اشک بہائے نہ بنے

لوگ کر لیتے ہیں تعمیر یہاں تاج محل
ہم نے مٹی کے گھروندے بھی بنائے نہ بنے

اس کی تصویر کے رنگوں کو دعا دیتا ہوں
صبح کی دھوپ بنے شام کے سائے نہ بنے

خود نمائی نے دکھایا ہے کرشمہ، ورنہ
غم کوئی چہرہ نہیں ہے کہ چھپائے نہ بنے

میرا مقسوم ہے شاید وہی سرمایہ رشید
جس کو پائے نہ بنے پا کے گنوائے نہ بنے

رشید کامل

۶۔ غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے (غالب)

انجام سفر کیا ہے یہ دیکھا نہیں کرتے
منزل کی بھی ہم لوگ تمنا نہیں کرتے

آ و کبھی گرداب کی آغوش میں یارو
ساحل سے تلاطم کا نظارہ نہیں کرتے

زخموں کی نمائش ہمیں منظور نہیں ہے
ہم چارہ گروں کو کبھی رسوا نہیں کرتے

خوش ہیں کہ تری راہ کی ہے دھول میسّر
ہم چاند ستاروں کی تمنا نہیں کرتے

تشہیرِ محبت تو نہیں شیوہ ہمارا
ملتے ہیں مگر ملنے کا چرچا نہیں کرتے

لے جائے کہاں تیری نظر اہلِ نظر کو،
ہم اہلِ نظر یہ کبھی سوچا نہیں کرتے

شہروں میں ترے حسن کی شہرت ہے یہاں تک
دیوانے بھی رخ جانبِ صحرا نہیں کرتے

مارا ہے ہمیں آپ کی اس پرسشِ غم نے
ہم اہلِ محبت کبھی شکوا نہیں کرتے

توہینِ محبت کا جو باعث ہے وجاہت
وہ اشک مری آنکھ سے ٹپکا نہیں کرتے

وجاہت حسین سونی پتی

۴۷- جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے (غالب)

جس کے ملنے کا تصوّر اتنا کیف انگیز ہے
اُس کی فرقت کس قدر بے کیف و وحشت خیز ہے

اُس کے لُطف و جور میں کیسے تفاوت کیجیے
اس کی ہر عادت مری نظروں میں دل آویز ہے

آسماں پر آج ماہِ نیم ماہ آیا نظر
میرے دل میں پھر کسی کی آتشِ غم تیز ہے

میری آنکھوں میں ضیا افگن ہے کون ایسا حسیں
میرا دل کس ماہ وش کی یاد سے لبریز ہے

اُس کی آنکھیں چشمِ آہو سے زیادہ تابناک
اس کی بوئے زلف نافے سے بھی عنبر بیز ہے

جب سے نظروں میں سمایا ہے وہ رشکِ ماہتاب
ماسوائے اشتیاقِ دید کے پرہیز ہے

کوئے جاناں سے ملاتا ہے وہ اپنے خلد کو
واعظِ سادہ بیاں بھی کتنا رنگ آمیز ہے

کوہکن کے جذبِ دل کی قدر مجھ سے پوچھیے
میری نظروں میں مآلِ شوکتِ پرویز ہے

آپ ماضی کے مظالم سُن کے حیراں ہو گئے
آج بھی دنیا میں زندہ سُنّتِ چنگیز ہے

اِس زمیں نے بھی کئی اہلِ سخن پیدا کیے
خطۂ لاہور رشکِ دہلی و تبریز ہے

میر و غالب کی غزل گو خوب تھی بے شک، مگر
یہ زمیں پہلے کی مانند آج بھی زرخیز ہے

خالدؔ بزمی

ع ؎- جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے (غالب)

○

یہ منظر اُس کی نفرت کا نہ دیکھا جائے ہے مجھ سے
وہ جب مل جائے رستے میں تو کترا جائے ہے مجھ سے

عدو کی دشمنی جوشِ رقابت کے سبب ہو گی
مِرا سایہ نہ جانے کیوں اُلجھتا جائے ہے مجھ سے

غنیمت ہے کوئی تصویر ہی رہ جائے پانی میں
کہاں یہ وقت کا سیلاب روکا جائے ہے مجھ سے

میسّر آ سکی مجھ کو نہ تنہائی کی لذّت بھی
میں بچتا ہوں مگر ہر شخص ٹکرا جائے ہے مجھ سے

ہم آغوشی کی حسرت، نارسائی، سخت مایوسی
مرا پھیلا ہوا بازو لپٹتا جائے ہے مجھ سے

کبھی گردش کی بے آواز ساعت کا فسوں ٹوٹے
رگوں میں موجِ خوں بن کر نہ دوڑا جائے ہے مجھ سے

حفاظت سے چھپا رکھی ہے دل میں درد کی دولت
یہ گنجینہ کسی کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

مسلسل ہو رہی ہو جبکہ سنگِ وحشت کی بارش
کہاں پھر کانچ کا ملبوس پہنا جائے ہے مجھ سے

کبھی خلوت میں اُس کو بے تکلف دیکھ لے کوئی
جو سب کے سامنے صدیقؔ شرما جائے ہے مجھ سے

صدیق افغانی

ع: "جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی" (غالب)

○

وہ چاہتے ہیں اُن کو نہ چاہا کرے کوئی
جب دِل پہ اختیار نہ ہو کیا کرے کوئی

اِک دِل ہے اور کشمکشِ سیلِ آرزو
دشوار ہے کہ تیری تمنّا کرے کوئی

چاکِ جگر ہے، چاکِ گریباں نہیں ہے یہ
اے کاش! چارہ گر کا مداوا کرے کوئی

ہم آرزوئے دید کو سو بار رو چکے
لیکن کبھی پیام تو بھیجا کرے کوئی

رسوائیوں کا خوف ہے کس رُوسیاہ کو
سو بار میرے عشق کا چرچا کرے کوئی

یہ جستجو بھی ایک طرح کا فریب ہے
دِل میں تجھے چھپا کے نہ رکھا کرے کوئی

خلوت فروز پردۂ دیوار تابہ کے
بالائے بام آ کے تماشا کرے کوئی

سوئے ادب ہے فکرِ سخن اِس زمین میں
کیا کیجیے جو روز تقاضا کرے کوئی

ہم پیشگی غالب و اقبال ہے محال
صادقؔ! خیالِ خام نہ رکھا کرے کوئی

آغا صادقؔ

ع ۱۔ میرے دکھ کی دوا کرے کوئی (غالب)

کیا تسلی دیا کرے کوئی — کیسے میری دوا کرے کوئی

بجلیاں تو ہیں گوشِ بر آواز — شرط یہ ہے، صدا کرے کوئی

دل سے شغلِ حیات قائم تھا — دل نہیں اب تو کیا کرے کوئی

رشتۂ دار اب بھی دُور نہیں — شرط یہ ہے وفا کرے کوئی

حشر کا مرحلہ بھی اور سہی — حشر ہی اب بپا کرے کوئی

اک تمنّا تو لاکھ جھگڑے ہیں — اب تمنّا ہی کیا کرے کوئی

جس میں اُمید کہ نہ یاس کوئی — ایسے دل کو بھی کیا کرے کوئی

موت آئے گی وقت پر ساحؔر
زیست کیوں بے مزا کرے کوئی

ساحِر بخاری

ع :- کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے (غالب)

اِس قدر لے دِل عدو نے مدعا ہو جائیے
مہرباں ہوں وہ تو ان سے بھی خفا ہو جائیے

کھینچ لیجئے دل سے خونِ آرزو کو آنکھ میں
اُن کے آگے بے نیازِ التجا ہو جائیے

قیصر و جمشید اِن کی بارگہ کو دیکھ کر،
جی میں کہتے ہیں کہ اُس در کے گدا ہو جائیے

شب کا اُن کا آستاں ہے پاسباں کا جو رہے
آج آجائے تو ممنونِ قضا ہو جائیے

کھینچ لیجئے گوشہ خلوت سے پہلو میں انہیں
آج دستِ عجز میں زورِ دعا ہو جائیے

دوڑتا ہے جسم کی ہر رگ میں خونِ آرزو
کس طرح قیدِ محبّت سے رہا ہو جائیے

دامنِ وسعت حیاتِ خضر کا دکھلائیے
بحرِ الفت میں حباب آسا فنا ہو جائیے

روز پیدا کیجئے دامن سے تصویرِ شفق
دیدۂ خونبیں سے رودادِ وفا ہو جائیے

جان لینے کے لئے انداز دل کش چاہیئے
میرے دل میں آکے دردِ لا دوا ہو جائیے

سب سے مل جل کر بھی چلئے سب سے رہئے دور بھی
کارواں میں مثلِ آوازِ درا ہو جائیے

پے بہ پے گر ظلم بے جا ہے تو مطلب ہے یہی
سر بہ سر تصویرِ تسلیم و رضا ہو جائیے

آفتاب و ماہ کو بھی یہ تمنّا ہے نظیرؔ
دہر میں پروانۂ شمعِ حرا ہو جائیے

نظیرؔ لدھیانوی

ع۱۔ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے (غالب)

سوز و گدازِ شوق کی دُنیا کہیں جسے
دِل وہ مقام ہے ترا کعبہ کہیں جسے

دیکھی ہے تشنگانِ محبت نے بارہا
وہ اِک نظر سرابِ تمنّا کہیں جسے

کرتے ہیں یاد آج بھی ہم کشتگانِ ناز
غارت گرِ جہاں کو مسیحا کہیں جسے

کیا کہہ دیا ہے موجِ نسیمِ بہار نے
ایسی لگی ہے آگ تماشا کہیں جسے

جنّت نہیں ہے صحنِ چمن میں نظر کہیں
وہ جوشِ فصلِ گل ہے کہ پروا کہیں جسے

یُوں تیری یاد سے ہے مُعطّر نفس نفس
معجز نمائیِ لبِ عیسےٰ کہیں جسے

حافظؔ زمانے بھر میں پکارا نہ مل سکا
ایسا کوئی بھی شخص کہ اپنا کہیں جسے

حافظ لدھیانوی

ع :- سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے (غالب)

دیکھے ہیں کئی رنگ جو تنکا بھی جلا ہے
گو خاک ہوا شہر تماشا تو ہوا ہے

ہم کنجِ اماں ڈھونڈنے جائیں تو کہاں ؟
سائے میں ہے آرام نہ شعلے میں ضیا ہے

بھیگی ہوئی آنکھوں کو حقارت سے نہ دیکھو
طوفاں ہے اگرچہ کسی قطرے سے اٹھا ہے

اے دل کے دریچوں سے مجھے جھانکنے والے
تو کون ہے تجھ کو کہیں دیکھا تو ہوا ہے

گو اس نے مری آگ پہ شبنم نہیں ڈالی
لیکن مجھے چپ چاپ سلگنے تو دیا ہے

بولوں تو صدا سنتے ہیں میری در و دیوار
خاموش رہوں میں تو یہی میری سزا ہے

تم شب کے پرستار سہی آنکھ تو کھولو
سورج تو بڑی دیر ہوئی ڈوب چکا ہے

ہم کیا ہیں اگر خاک بسر پھرتے ہیں شہزادؔ
دریا بھی تو مٹی کے قدم چوم رہا ہے

شہزاد احمد

ع ، کوئی نہیں تیرا، تو مری جان خدا ہے (غالب)

○

جب سے وہ مرے دل کے گلستاں میں بسا ہے
ہر درد کے غنچے میں نیا روپ کھلا ہے،
یہ رمزِ عنایت ہے محبت کی ادا ہے
ہر رنگِ وفا اُن کا بہ عنوانِ جفا ہے
غیروں نے مجھے دیکھا ہے اِدراک سے آگے
کیا کم یہ ترے در کی غلامی کا صلہ ہے
غنچوں کے چٹکنے کی صدا تک نہیں آتی
گلزارِ خیالات کی اب کیسی ہوا ہے
دل تابہ نظر ایک ہی صورت کے ہیں جلوے
مہتاب میں وہ نور نہ کلیوں میں ضیاء ہے
مہکا ہوا ہے مثلِ ختن صحنِ تخیل،
کیا عطر فشاں کو چۂ گل دشت کی ہوا ہے
دیکھے ہیں بہت طلعت و نیرنگ کے پیکر
سبطین کوئی اُن سا نہ ہوگا نہ ہوا ہے

محمد سبطین شاہجہانی

ع کوئی نہیں تیرا، تو مری جان خدا ہے غالب

○

ہنستے ہوئے لمحات کا دل ڈوب رہا ہے
یہ سلسلہ جیسے مرے پہلو سے چلا ہے

جانا ہے مجھے بھی اسی منزل پہ زمانے
لیکن مرا رستہ ترے رستے سے جُدا ہے

رفتار میں ایسی بھی کہاں سُست روی تھی
پیچھے تھا جو میلوں وہ مجھے آن مِلا ہے

برسا نہ کسی سمت سے کھُل کر کوئی بادل
اِک حبس سا موسم میں بدستور جو تھا ہے

جانا تو تھا اوروں کی طرح اُس کو بھی اِک روز
اِس بات کا غم ہے کہ وہ بے وقت گیا ہے

کچھ دیر ہوئی روشنی لیکن کسے معلوم
ٹوٹا تھا جو تارا وہ کہاں جا کے گرا ہے

محمد جلیل عالی

ع:- گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے (غالب)

○

سُننے کے لئے مژدۂ پیغام بہت ہے
مہجورِ صدا کو یہی انعام بہت ہے

کیا ردِ عمل ہو مرے اس جوشِ جنوں کا
آغاز میں ہی حسرتِ انجام بہت ہے

لب تشنۂ گفتارِ تمنّا ہی رہوں گا
مجھ مُہر بہ لب پر یونہی الزام بہت ہے

شہرت نہ سہی دہر میں تشہیر ہی کچھ ہو
ہیں لوگ ترے ساتھ مرا نام بہت ہے

اب دل میں ترے وصل کی حسرت نہیں باقی
نومیدیٔ جاوید میں آرام بہت ہے

کاغذ کے حصار اب نہ اسے روک سکیں گے
سیلابِ خیالات سُبک گام بہت ہے

زندانیِ خاموشیٔ تصویر ہے زخمیؔ
احساسِ گرانباریِ آلام بہت ہے

محمد شبیر زخمیؔ

ع:- مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے (غالبؔ)

○

تیرے ستم کو زیست کا ساماں کئے ہوئے
زندہ ہیں لوگ چاکِ گریباں کئے ہوئے

راہِ حیات سے ہوں میں گزری بچشمِ تر
یادوں سے تیری ہر سو چراغاں کئے ہوئے

دیوانگی کی حد سے بھی آگے گزر گیا
وہ دل کہ تھا تصوّرِ جاناں کئے ہوئے

بیتے ہوئے دنوں کا تصوّر ہے آج کل
میری رہِ حیات کو تاباں کئے ہوئے

ویرانۂ حیات سے گزری ہوں بارہا
نظارۂ خیال کا ساماں کئے ہوئے

جب لُٹ چکی بہار نسیمؔ تو آج وہ
آئے ہیں اپنا حال پریشاں کئے ہوئے

نسیمؔ اشرف علی

ع:۔ مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے (غالب)

ہم جان و دلِ صنم پہ ہیں قرباں کئے ہوئے
مرنے کے بعد زیست کا ساماں کئے ہوئے

بیٹھے ہیں سوزِ دل سے چراغاں کئے ہوئے
اشکوں سے زیب و زینتِ مژگاں کئے ہوئے

روشن رکھا ہے ہم نے محبت کا غمکدہ
قلب و جگر کے داغ فروزاں کئے ہوئے

وحشت ہے آج وسعتِ صحرا میں گامزن
نذرِ جنونِ عشق گریباں کئے ہوئے

صحنِ تصورات میں بڑھتی ہیں رونقیں
آتا ہے جب تو زلف پریشاں کئے ہوئے

دِل منتظر ہے کب سے بہارِ خیال میں
اِمکانِ وصل۔ داخلِ امکاں کئے ہوئے

جتنی بھی مشکلات ہیں عالم میرے لئے
اُن کا خیال سب کو ہے آساں کئے ہوئے

فیاضؔ عالم یوسفی

ع :- صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے (غالب)

ہے جس کا نام سکوں بخش قلب و جاں کے لیے
مری جبیں ہے فقط اس کے آستاں کے لیے

نہ اِس جہاں کے لیے ہے، نہ اُس جہاں کے لیے
یہ زندگی ہے فقط اپنے دِلستاں کے لیے

غمِ بہار کے داغوں سے دِل منوّر ہے،
چراغ ڈھونڈ دو لیے ہم نے اس مکاں کے لیے

وہ آبِ جُو پہ قناعت نہ کر سکے گا کبھی
جو ہے شناوری بحرِ بیکراں کے لیے

خرد کی دوڑ ہے لے دے کے ماہ و پرویں تک
مرے جنوں کی تگ و دو ہے لامکاں کے لیے

مذاقِ راہ نوردی عطا ہوا ہے جنھیں،
تلاشِ خضر انہیں کیوں ہو کارواں کے لیے

کوئی نہیں ہے مِرا راز داں یہاں عابدؔ
ترس گیا ہوں گلستاں میں ہم زباں کے لیے

عابدؔ نظامی

ع ۱۔ بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے (غالب)

○

جو لفظِ عشق تراشا ہے داستاں کے لئے
ہے اختراعِ حسیں قلبِ ناتواں کے لئے

اُٹھے جو ہاتھ تو غیرت سے کپکپانے لگے
دُعا جو کی ہے کبھی قلبِ ناتواں کے لئے

یہ بے ثباتیِ دُنیا سے آشکارا ہے
جہاں ہمارے لئے ہے نہ ہم جہاں کے لئے

نکل نہ دیدۂ تر آنسوؤں کو پلکوں سے
یہ چند قطرے ہیں تسکینِ جاوداں کے لئے

اُنہی کو برقِ تپاں نے جلا کے خاک کیا
جو چار تنکے چُنے میں نے آشیاں کے لئے

بنا رہا ہوں حسیں اِس لئے نشیمن کو
کہ گھر میں کچھ تو رہے برقِ بے اماں کے لئے

نہ اِبتدا ہے نہ یہ انتہائے عشق نظیرؔ
تمام عمر پڑی ہے اِس امتحاں کے لئے

نظیر علی نظیرؔ

ع : میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں (غالب)

جب دیکھئے فسردہ دل و غم رسیدہ ہوں
اشکِ چکیدہ ہوں کہ میں آہِ کشیدہ ہوں

اِس بزمِ رنگ و بو میں ہے میری ہی مثال
اِک حرفِ آرزوئے بہ لب نارسیدہ ہوں

دل ان کے التفات سے محروم ہی رہا
میں گلستاں میں مثلِ نہالِ بریدہ ہوں

احباب میرے ذوقِ نظر سے ہیں بے خبر
گویا شریکِ محفلِ ناآفریدہ ہوں

کچھ لوگ شاد ہیں کہ انھیں کوئی غم نہیں
میں شاد ہوں کہ درد کا لذت چشیدہ ہوں

فطرت نے مجھ کو کیسا تماشا بنا دیا
میں گاہ خندہ لب ہوں، گَہے آبدیدہ ہوں

میرا ضمیر مجھ سے سدا غیر مطمئن
احباب کی نظر میں مگر برگزیدہ ہوں

میری برہنگی کو نہیں حاجتِ رفو!
میں دستِ روزگار سے دامن دریدہ ہوں

شایانِ شانِ دوست نہیں نذرِ جان و دل
بزمی میں بارِ فکر سے گردن خمیدہ ہوں

خالد بزمی

ع:- "بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم" (غالب)
(نسخۂ حمیدیہ)

وفا کا نشاں، سچ کا معیار ہیں ہم
مہِ خوں سرِ مطلعِ دار ہیں ہم

جو رکھتے ہیں گرمِ فغاں بے بسوں کو
اُنہی سرد جذبوں کا اظہار ہیں ہم

گرفتارِ خود جس میں حُسنِ ازل ہے
اُسی کرب کے آئینہ دار ہیں ہم

اندھیروں کے جنگل میں ہیں پا شکستہ
مگر عازمِ شہرِ انوار ہیں ہم

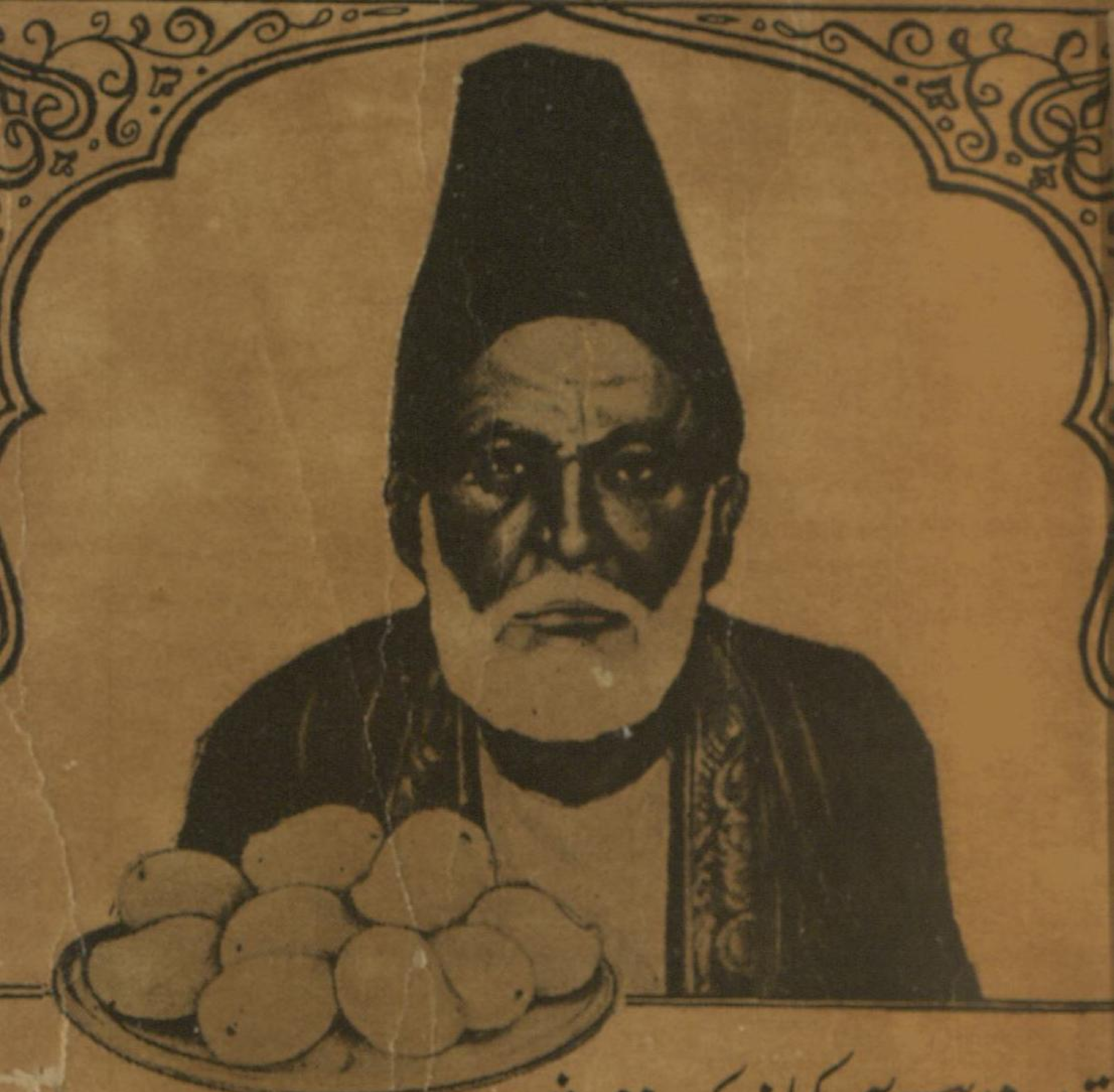
جو عنوانِ تسلیم و تعظیم ٹھہرے
وہ کردارِ تمثیلِ پندار ہیں ہم

سرِ راہِ دل، ہاتھ پھیلائے کب سے
ترے منتظر، مثلِ اشجار ہیں ہم

ہمارا مقدر ہے شامِ غریباں
کہ صبحِ طرب کے عزادار ہیں ہم

فضا دیکھ کر کُہر آلود تائبؔ
خلافِ طبیعت شرربار ہیں ہم

حفیظ تائب



صد سالہ برسی کے موقعے پر

یر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب

کی

زندہ و پائندہ

ادبی اقدار

کو

ہمارا سلام

نائیٹڈ بنک لمیٹڈ

ملکی اور عوامی خدمت میں سب سے نمایاں اور